جل پری

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم الله الرحمن الرحيم

جل پری

فوزیہ تاج

سورتی اکادمی
کراچی، پاکستان

کتاب : جل پری

مصنّفہ : فوزیہ تاج

زیرِ نگرانی : حمزہ ابنِ وصی، شکیل حُسین خان

طباعت : تنویر ایسوسی ایٹس +92 302-8291575

Tel: +92 21-34545628

asadtanvir.ta@gmail.com

کمپوزنگ : محمّد علی عطّاری +92 300-2696830

اشاعتِ اوّل : اکتوبر 2023

ناشر : سُورتی اکادمی، ٹیم موکسی، کراچی

تعداد : 1001

آئی ایس بی این : 978-627-7701-02-04

جملہ حقوق بحقِ سُورتی اکادمی محفوظ ہیں

پبلی کیشن کی جدید ٹیکنالوجی کے مطابق کتاب کی اشاعت کے لیے رابطہ:

+92 334-2981432

E:mail: hamza_haider@live.com

انتساب

بنتِ حوّا کے نام!

جو ازل سے اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔

فہرست

❖ ...... تخیلات وتصوّرات کی انجذابی شکل ''جل پری''	حمزہ ابنِ وصی	9
❖ ...... فوزیہ تاج صاحبہ کے اوّلین ناول اور اَدبی سفر کا جائزہ	سیّد علی تنہا	12
❖ ...... دیباچہ	فوزیہ تاج	16
● ...... ''جل پری'' (حصّہ 1)		19
● ...... ''جل پری'' (حصّہ 2)		25
● ...... ''جل پری'' (حصّہ 3)		28
● ...... ''جل پری'' (حصّہ 4)		34
● ...... ''جل پری'' (حصّہ 5)		40
● ...... ''جل پری'' (حصّہ 6)		42
● ...... ''جل پری'' (حصّہ 7)		46

● ...... ''جل پری''(حصّہ 8)	52
● ...... ''جل پری''(حصّہ 9)	56
● ...... ''جل پری''(حصّہ 10)	58
● ...... ''جل پری''(حصّہ 11)	63
● ...... ''جل پری''(حصّہ 12)	68
● ...... ''جل پری''(حصّہ 13)	74
● ...... ''جل پری''(حصّہ 14)	79
● ...... ''جل پری''(حصّہ 15)	84
● ...... ''جل پری''(حصّہ 16)	89
● ...... ''جل پری''(حصّہ 17)	95
● ...... ''جل پری''(حصّہ 18)	99
● ...... ''جل پری''(حصّہ 19)	102
● ...... ''جل پری''(حصّہ 20)	108
● ...... ''جل پری''(حصّہ 21)	112
● ...... ''جل پری''(حصّہ 22)	116
● ...... ''جل پری''(حصّہ 23)	120
● ...... ''جل پری''(حصّہ 24)	125

تخیلات وتصوّرات کی انجذابی شکل ''جل پری''

عام طور پر فکشن پر مبنی تحاریر جہاں استغراق کی دعوت دیتی ہیں وہیں ایسی تحریروں کے فنی محاسن قاری کو تخلیق سے ربط بحال کرنے میں مشکلات بھی مہیا کرتے ہیں۔ میں محترمہ ''فوزیہ تاج'' کا تہ دل سے سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی کتاب ''جل پری'' کے بارے تبصرہ رقم کرنے کی سعادت مجھے دی۔ میری کاوش ہے کہ میں مختصراً جامع گفت راست کی پگڈنڈیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کتاب اور اس کی مصنفہ کے تخلیقی مظاہر کو اپنی تفہیم وتشریح کے اعتبار سے پیش کروں۔

''جل پری'' ایک ایسی کتاب ہے جس کا تعلق ادب برائے ادب اور اَدب برائے زندگی دونوں سے ہے۔ کہیں محترمہ فوزیہ تاج کا تخیل حقیقت کے سامنے زجاجی حقیقت کی صورت اُمنڈتا نظر آتا ہے اور کہیں فوزیہ تاج صاحبہ کی تحقیق ان کے تخیل وتیقن کی رُوداد محسوس ہوتی ہے۔ میں اس کتاب کے رموز بیان کرنا مناسب نہیں سمجھوں گا کیوں کہ یہ قاری کے ساتھ زیادتی ہوگی کہ اس کے باطن سے کہانی کے بارے اشتیاقی کیفیت کو معدومیت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرا قصد فوزیہ تاج صاحبہ کے اسلوب اور تخیل و تحقیق مع قلم کاری کے اسالیب کی نشاندہی ہے جو قابلِ اعتراف ہیں۔

''جل پری'' کتاب کو پڑھتے ہوئے مدرکہ کیفیات اپنے اشتداد کا مظہر پیش کرتی ہیں۔ جس طرح سے ''جل پری'' کے روپ کو فوزیہ تاج نے تمثیل وتشبیہ کے طور استعمال کیا وہ آسان

نہیں بلکہ یہ کتاب ایک تجربہ کار لکھاری کی کثرت کی پیش کش معلوم دیتی ہے۔ اگر ہم کتاب ''جل پری'' کی ضخامت کو زیرِ بحث لائیں تو قاری ششدر رہ جاتا ہے کہ ایک کتابچے کی مماثلت رکھنے والی کتاب اپنے اندر کن کن مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ اگر ایک قاری تعمق و ژرف نگاہ سے مطالعہ کرے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب احساسات، خیالات، تغیرات، تعلیلات، تعلیمات کی کئی صورتیں پیش کرتی نظر آتی ہے۔

فوزیہ تاج صاحبہ کی ادبی زبان کا ذکر کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ''جل پری'' اس کی بہترین دلیل ہے۔ معتدل الفاظ، خیالات و واقعات کا ربط، منظر کشی کا اندازِ بیان آسان الفاظ کے ساتھ ساتھ قاری کے لاشعور کو جھنجوڑتا محسوس ہوتا ہے۔ فوزیہ تاج کا مضمون ''جل پری'' اس کتاب کے حوالے سے ویسے ہی ایک عام قاری کو قلبی طور امالہ کرتا ہے کہ فی الفور اس کتاب سے رفاقت کا رشتہ استوار ہو سکے۔

''جل پری'' بنیادی طور پر رُوداد اور داستان گوئی کا ایسا مظہر ہے جس کی استعماریت محترمہ فوزیہ تاج کے ذہنی دفتر میں تشکیل پائی ہے۔ ہر باب اپنے اندر ایک پورا منظر نامہ رکھتا ہے اور پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آنکھوں کے سامنے پورا منظر محسوس ہو رہا ہو۔ فکشن، انفرادیت، اجتماعیت، مشاہدات کے ایک ایسے نظم کو استقرار کا درجہ دینا نہایت مشکل ہوتا ہے، مگر فوزیہ تاج نے اپنی قلم کی طاقت سے اپنے مضمون کو بے جان نہ ہونے دیا۔ ادبا اور مؤقر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ فوزیہ تاج صاحبہ دیانت داری کے ساتھ اپنی تحریروں میں رنگ بھرتی محسوس ہوتی ہیں اور زندگی کے رنگوں پر مبنی برش سے اپنا خیال قرطاس پر پینٹ کرتی ہیں۔

جس طرح ایک مصوّر اپنے شاہ کاروں میں غیر معمولی مناظر منعکس کرنے کے بعد پیغامات کی ترسیل کا ایک نظم پیدا کرتا ہے اسی طرح فوزیہ تاج صاحبہ نے اپنے شعوری تخیلات کی اُنگلی پر چلتے ہوئے نظر آنے والے ہر منظر کو کتاب ''جل پری'' میں عکس کیا ہے۔ ان کی کہانی

اقساط کے اشتمال پر تشکیل دی گئی ہے اور جس طرح سے انھوں نے جھل مگسی اور مختلف کردار کے معاملات کو قلم سے تصویر کیا ہے وہ ایک ایسا مصنّف ہی کرسکتا ہے جو شعوری و لاشعوری طور پر ربودگی کا شکار نہیں بلکہ اپنے شعور کی کسوٹی کو اپنا ہتھیار سمجھتا ہو۔ ''جل پری'' کی کتاب پڑھتے ہوئے قاری محترمہ فوزیہ تاج کے نہ صرف تخیل سے ربط استوار کرے گا بلکہ اس کتاب کو بطورِ نصاب ایک ادبی پارہ تسلیم کرے گا۔ حقائق پر مبنی تاویلات و توجیہات اس کتاب کی تراکیب و ترویج کا خاص رُخ آشکارا کرتی ہیں۔

روایت و جدت کے اسلوب کے ساتھ فوزیہ تاج صاحبہ کے لکھنے کا انداز ہر انسان کے انفرادی وجود کا مقدمہ پیش کرتا ہے اور خاص کر اجتماعیت کے مخفیات کو بھی ایک خاص طرق سے بیان کرنے کی اعلیٰ مثال فوزیہ تاج کے یہاں ملتی ہے۔

محترم فوزیہ تاج کی اس کاوش کو جتنا سراہا جائے کم ہے جب کہ وہ اپنی گھریلو اور سرکاری ذمے داریوں کو ابھی اپنی زندگی کا اچھا خاصہ حصّہ ہبہ کرتی آئیں ہیں اور مستقبل بھی اس امکان سے بھرا ہے۔ اتنی مصروفیت کے بعد بھی اپنی تخلیقی کاوشوں کو تقویت بخشنا اس بات کے اثبات فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنی فطرت میں ایک معتبر لکھاری ہیں۔ ان کے اس سفر کو استقلال کے ساتھ جاری و ساری رہنا چاہیے۔ محترمہ فوزیہ تاج کو اسی طرح شعور کے منازل طے کرتے رہنا چاہیے اور اپنے علم سے دوسروں کو مستفید بھی کرتے رہنا چاہیے کیوں کہ یہ ان پر ملزوم ہے۔ ''جل پری'' اپنے اندر ایک منفرد ادبی پارہ ہے جو نہ صرف قاری کو خوش خیالی فراہم کرتا ہے ساتھ ساتھ فوزیہ تاج کی غیر معمولی قابلیت کا اعتراف بھی کرواتا ہے۔

حمزہ ابنِ وصی

نثر نگار

سورتی اکادمی

فوزیہ تاج صاحبہ کے اوّلین ناول اور اَدبی سفر کا جائزہ

سنگ ریزے و جل پری کی مصنّفہ لطیف و حسین جذبوں کی مالک معروف شاعرہ، ادیبہ محترمہ فوزیہ تاج صاحبہ ایک بہترین شاعرہ کے طور پر تو اپنے آپ کو ادبی حلقوں میں بہت پہلے ہی منوا چکی ہیں مگر وہ کتنی بڑی ادیبہ بھی ہیں اس کا ثبوت ہمیں ان کے منظرِ عام پر آنے والے اس ناول میں ملتا ہے۔آپ کی اس نثری تخلیق جو ایک ناول کی شکل میں ہے اس سے قبل بھی آپ نے مضمون نگاری کے ایک انعامی مقابلے میں پاکستان بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی اور آپ کے اعزاز میں راولپنڈی آرٹس کونسل میں ایک عالیشان پروگرام بھی منعقد کیا گیا جس میں مجھ خاکسار کو بھی مدعو کیا گیا۔آپ کی یہ کامیابی اس بات کی واضح غمازی کرتا ہے کہ آپ اُردو اَدب کی متعدّد اصناف پر بخوبی طبع آزمائی کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔محترمہ فوزیہ صاحبہ سے میرا ادبی رشتہ دیرینہ ہے چند سال قبل آپ کے اوّلین شعری مجموعے سنگ ریزے کے بعد اب ان کے اوّلین ناول ”جل پری“ کو منظرِ عام پر دیکھ کر فرطِ حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک ایسے شعبے سے وابستہ شخصیت جن کا پالا سارا دن جرم اور مجرموں سے پڑتا ہے۔وہ ایک بے مثال شاعرہ اور ادیبہ بھی ہیں۔

چوں کہ ہمارے ارد گرد کا ماحول انسان پر اثر انداز ضرور ہوتا ہے تو ایسے حالات میں طبیعت میں تلخی یا سختی کی توقع کرنا ایک عام سی بات ہو سکتی ہے مگر اس کے برعکس فوزیہ صاحبہ

کے اندر کے چھپے حساس ولطیف جذبوں نے ایک بہترین شعری اور اَب نثری تخلیق کو منظرِعام پر لا کر اس بات کی نفی کر دی کہ ہیرے پر مٹّی کی گرد پڑنے کے بعد بھی وہ ہیرا ہی رہتا ہے یعنی ظاہری ماحول خواہ وہ کتنا ہی گرد آلود ہو مگر وہ ایک باکردار و باضمیر حساس انسان کے باطن کو کبھی میلا نہیں کر سکتا۔ ایک اچھا قلمکار ہونا الگ موضوع ہے، ایک بہترین انسان ہونا الگ موضوع اور محترمہ فوزیہ تاج صاحبہ میں یہ دونوں خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ آپ ایک نیک دل، انتہائی شفیق مہمان نواز، جامع الکمالات، نجیب الطرفین پیکرِ اخلاص و عجز و انکسار شخصیت کی حامل ہیں۔ آپ سے مل کر صدیوں کے غم غلط ہو جاتے ہیں۔ آپ اتنے بڑے عہدے پر فائز ہیں مگر گھمنڈ آپ کو چھو کر نہیں گزرا کیوں کہ آپ امن چاہتی ہیں، زندگی کا تحفظ چاہتی ہیں، انسانیت کا احترام اور حقوق کا تحفظ چاہتی ہیں۔ آپ کا المیہ یہ ہے کہ آپ بہت حساس اور انسان دوست شخصیت کی مالک ہیں۔

آپ کی شخصیت میں ٹھہراؤ ہے مستقل مزاجی ہے۔ دوسرے کی بات کو انتہائی توجّہ سے سننا اس کا دھیمے لہجے میں جامع اور مختصر جواب دینا آپ ہی کا خاصہ ہے۔ آپ اپنی ذات کی غلام گردشوں میں قید نہیں بلکہ انسانیت کی اصل معراج سے بخوبی آشنا ہیں۔ آپ ہر دوسرے انسان کو خود سے اعلیٰ و ارفع سمجھتی ہیں خامیوں کو چھوڑ کر خوبیوں پر نظر رکھنے والی اعلیٰ اوصاف کی مالک ہیں۔

ہمارے اس مشرقی معاشرے کا المیہ ہے کہ یہاں عورتوں کو قدم قدم پر تحفظات کا سامنا ہوتا ہے ایسے کڑے حالات میں جہاں مستورات کے حوالے سے ادبی فضا گھٹن زدہ ہو۔

کسی شعری یا نثری تخلیق کا منظرِعام پر لانا بہت بڑی بات ہے مگر محترمہ فوزیہ تاج صاحبہ کے اندر کے چھپے ہوئے حساس و توانا جذبوں نے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کر دکھایا۔

آپ کی دونوں کتابوں کا مطالعہ کیا۔ بلاشبہ آپ کی شعری و نثری تخلیقات حرفِ آغاز سے حرفِ انجام تک بیحد عمدہ اسلوب پر مشتمل ہیں۔

آپ نے اپنے ناول میں مختلف کرداروں کو موضوعِ گفتگو بنا کر دراصل پتّھر دل زمانے والوں کا کوڑھ زدہ چہرہ بے نقاب کیا جہاں قدم قدم ہر رسموں رواجوں کی پابندیاں ہیں تلخ لہجوں کے نشتر ہیں طنز رویوں میں بسی سرد مہری ہے جو ایک دن خود بھی انسان کو پتّھر بنا دیتی ہیں۔

کرداروں کے ساتھ انصاف کرنا کا فن بخوبی آپ کو آتا ہے ناول میں کرداروں کا آپس میں ربط بے مثال ہے ایسی روانی سے شروع کرتی ہیں کہ قاری اس کو ختم کیے بنا سانس نہیں لیتا جو دیکھتی ہیں محسوس کرتی ہیں اسے من وعن بیان کرتی ہیں۔آپ متعدد موضاعات کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنے کا مکمل ہنر رکھتی ہیں۔

محترمہ فوزیہ تاج صاحبہ کی تخلیقات کسی مبتلائے عشق کی وارداتِ قلبی یا اپنی غربت پہ نوحہ کنا کا نام نہیں بلکہ آپ تو زمانے والوں کی آنکھ ہیں ان کا آئینہ ہیں جس میں دنیا والے اپنا حقیقی عکس دیکھتے ہیں۔آپ ہر انسان کے جذبوں کی ترجمان ہیں۔آپ کا فکری و علمی کینوس صرف کا کلِ پیچاک یا چاند چہرے تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ آپ کے الفاظ تو حسین پھُولوں کا گلدستہ ہیں جس میں ہر رنگ کا پھُول شامل ہے اور آپ الفاظ کے ان پھُولوں کی مہک سے زمانے کی سانسوں کو مہکا رہی ہیں اور آپ اپنے لفظوں کے نور سے ظلمت بھرے جہاں کو منور کر رہی ہیں۔

آپ دنیا میں بسنے والی ہر ذی رُوح سے محبت کرتی ہیں۔آپ ہر ایک کی فغاں کو اپنی فغاں سمجھتی ہیں اور قدرت کی بنائی ہوئی ہر چیز کو تخیل کی آنکھ سے دیکھ کر اپنے لفظوں میں قلمبند کرتی ہیں۔

اگر آپ اسی طرح ادب کی آبیاری کرتی رہیں اور آپ کے اندر آگے بڑھنے کی طلب کبھی کم نہ ہوئی۔قابل اساتذہ ،مشاہدۂ کائنات وسیع وعمیق مطالعہ کا دامن نہ چھوڑا اور آپ اپنے ان لطیف جذبوں کو اسی طرح لفظوں کا پیرہن پہناتی رہیں تو بہت جلد ہزارہ کی دھرتی اپنی اس دختر پر فخر کرے گی۔

اپنی بساطِ تحریر سمیٹتا ہوں دعا گو ہوں کہ خدائے لم یزل آپ کو کامیابیوں اور کامرانیوں سے سرفراز فرمائے۔

آپ کے رزقِ قلم اور کڑی ریاضت وسیع وعمیق مطالعہ مشاہدۂ کائنات میں دن بہ دن اضافہ ہو۔مولائے کائنات ؓ آپ کو ادب کے اُفق کا چمکتا دمکتا ستارا بنا دے اور آپ کے رزقِ قلم رزقِ سخن میں مزید اضافہ فرمادے۔آمین

دُعا گو

سیّد علی تنہا

شاعر،ادیب،تبصرہ نگار

دیباچہ

''جل پری'' ایک علامتی کہانی ہے جسے مَیں نے داستان کے طور پر بیان کیا۔ مَیں دراصل اپنے معاشرتی نظام کو ایک عرصے سے دیکھ، سُن اور پڑھ رہی ہوں اور ہمارے اس معاشرے میں عورت نامی مخلوق اس بے دردی سے پستی ہے کہ اس طرح تو چکّی کے دو پاٹوں کے درمیان شاید گندم بھی نہیں پستی ہوگی۔ عورت کے بارے میں بہت سی کہانیاں لکھی گئیں۔ اس کے حسن و جمال سے لے کر محبت، وفا اور بے وفائی تک کے بارے میں بھی دل کھول کر لکھا گیا۔ دردمندوں نے اس پہ ڈھائے جانے والے مظالم بھی بیان کرنے میں کوتاہی نہیں کی لیکن میں ایک ایسا کردار تخلیق کرنا چاہتی تھی جو اس سے قبل کسی نے تخلیق نہ کیا ہو اور میری جستجو مجھے دنیا سے ہوتی ہوئی سمندر کی تہ میں لے گئی جہاں سمندری مخلوق میرے ناولٹ کا موضوع بن گئی اور ''جل پری'' اس کہانی کے مرکزی کردار کے طور پہ سامنے آئی۔ پھر مجھے ایک طویل عرصے تک سمندری مخلوق کے ساتھ زیرِ سمندر رہنا پڑا۔ لکھتے وقت میں واقعی خود کو جل پری کی ہمجولی بنا لیتی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے اپنے کسی بہت قریبی دوست کا غم گسار بننا۔ جس کے پاس آپ کے علاوہ کوئی ایسا شخص نہیں ہوتا جس کے سامنے کتھارسس ہو سکے۔

مَیں نے جب بھی کوئی کردار تخلیق کیا قارئین کو شاید سُن کر حیرت ہوگی کہ وہ مجھ سے

بات کرتا ہے... میرے سامنے آنسو بہاتا ہے اور اپنا آپ خود، مجھ سے لکھواتا ہے۔ اس کہانی کے ہر کردار کو مَیں نے دل سے تخلیق کیا اور اپنے جذبات سے ان میں رنگ بھرا۔ پھر جب کچھ پڑھنے والوں نے مجھ سے سوال کیا کہ:

''کیا آپ کافی عرصے تک آبی مخلوق کے ساتھ سمندر کی تہ میں قیام پذیر رہی ہیں؟؟''

اس سوال سے بطور لکھاری مجھے دلی تسکین ہوئی کہ میں کہانی لکھنے کے اس عمل میں، جہاں جہاں جاتی رہی وہیں، قاری کی اُنگلی تھامے اسے بھی ساتھ ساتھ لے جانے میں کامیاب رہی۔ جب ایک لکھاری کوئی کردار تخلیق کرتا ہے تو وہ پہلے خود ان کرداروں کے ساتھ اُٹھتا، بیٹھتا بلکہ جیتا ہے۔ ان کے ہنسنے پہ ہنستا اور رونے پہ روتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسے اپنے کرداروں سے اُنسیت سی ہونے لگتی ہے اور وہ کامیاب تب ہوتا ہے جب وہ اپنے قارئین کو بھی اپنے کرداروں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور جینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ پھر قارئین بھی ان کرداروں سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ ان کے دُکھوں پہ رنجیدہ اور خوشیوں میں خوش ہوتے ہیں۔

کہانی لکھتے وقت کسی قسم کی منظر کشی کرنا ایک بے حد مشکل امر ہے۔ معمولی سی بھی بھول چوک سے بیانیے پر سے قاری کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور آنکھوں کے سامنے سے منظر سرک جاتا ہے اور کہانی کے ساتھ ساتھ قاری پہ بھی جمود طاری ہو جاتا ہے۔ لہٰذا میں نے سمندر کے اس سفر کے دوران ایک لمحے کے لیے بھی پلک نہیں جھپکی اور کوشش کی کہ قاری اپنے آپ کو سمندری دنیا اور اس کی مخلوق میں اجنبی نہ محسوس کرے۔ اپنی اس کاوش میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں اس کا جواب تو قارئین ہی بہتر طریقے سے دے سکتے ہیں۔

اس کہانی میں مثبت کرداروں کے ساتھ کچھ منفی کردار بھی ہیں جو کہانی میں افسانوی رنگ ہونے کے باوجود حقیقت سے قریب کر دیتے ہیں کیوں کہ بعض اوقات تخیلاتی و دیومالائی کردار تخلیق کرتے وقت لکھاری اس قدر مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے کہ تحریر کا حُسن ختم

ہو جاتا ہے لہٰذا میں نے بھرپور کوشش کی ہے کہ ان تمام دیومالائی کرداروں کو تخلیق کرتے ہوئے حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑوں۔

مجھ سے یہ سوال بھی کیا گیا کہ میرے ذہن میں یہ اچھوتا خیال کیوں کر آیا کہ مَیں نے عورت کی معاشرتی وسماجی حیثیت اور مسائل کو اُجاگر کرنے کے لیے اسے جل پری کے روپ میں ڈھال کے پیش کیا۔جل پری دراصل ہمارے معاشرے کا ہی ایک جیتا جاگتا کردار ہے جسے استعاراتی وعلامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اسے جل پری کے روپ میں بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح جل پری ایک نامکمل عورت ہوتی ہے اس طرح عورت بھی ہمیشہ نامکمل ہی رہتی ہے۔اس کی آدھی زندگی والدین کے گھر اور بقیہ شوہر کے ساتھ گزرتی ہے۔خود سے جڑے رشتے تیاگ کر وہ ایک نئی زندگی میں قدم تو رکھ لیتی ہے...مگر تکمیلِ ذات کی جستجو میں تاعمر ہی برسرِ پیکار رہتی ہے اور آخر کار یہ عقدہ کھلتا ہے کہ وہ تو ہمیشہ سے ہی ادھوری تھی...اور...اسے ہمیشہ ہی ادھورا رہنا ہے پھر نہ ہی آگے بڑھنے کا راستہ دکھائی دیتا ہے اور نہ پیچھے مڑ سکتی ہے۔زندگی کی منجدھار میں پھنسی ہوئی عورت پھر جل پری بن جاتی ہے جو ساری عُمر ساحلوں پہ بین کرتی رہتی ہے جس طرح جل سوکھ جانے پہ سوکھے جل کی مچھلیاں...زندگی سے مات کھا جاتی ہیں...!!

فوزیہ تاج

”جل پری“ (حصّہ 1)

وہ ایک جل پری تھی۔کسی رانی کی طرح ایک جل میں رہتی تھی۔وہ زندگی بہت خوب صورت تھی۔نہ کوئی دُکھ، نہ تکلیف، سارا وقت مستیاں کرتی۔سکھیوں سے کھیلتی، مچھلیوں سے باتیں کرتی۔اپنی رنگ برنگی خوب صورت لمبی دُم کے ساتھ اِدھر اُدھر قلانچیں بھرتی پھرتی تھی۔وہ بے حد خوب صورت اور دلکش تھی۔اس کا آدھا اُوپری دھڑ انسانی عورت کا ساتھا اور آدھا دھڑ کسی بڑی خوب صورت مچھلی جیسا تھا۔اس کی دُم پہ جا بجا رنگین دیدہ زیب چھوٹے بڑے نگینے جڑے تھے۔ہر نگینے کا رنگ دوسرے سے جدا اور سب سے حیران کن بات کہ وہ نگینے اس کے مزاج کے مطابق اپنا رنگ بدلتے رہتے تھے اور رات کے اندھیرے میں پانی کی لہروں میں ہیرے کی مانند جگمگ جگمگ کرتے تھے۔وہ واقعی میں جل کی ملکہ تھی۔اس کے ماتھے پہ بہت ہی خوب صورت اور بنفشی رنگ کے دو مور پنکھ تھے جو کہ اس کی پیشانی میں ہی پیوست تھے اور اس کی خوب صورتی کو چار چاند لگاتے تھے۔سورج کی نارنجی شعاعیں جب ان

پر پڑتیں تو ان کا بنفشی رنگ چمکتے ہوئے سورج کی طرح ہو جاتا تھا۔ ان پروں کے ساتھ عجیب وغریب داستانیں جڑی تھیں جو وہ اکثر اوقات مہا مچھلی سے سنتی رہتی تھی۔

ضلع جھل مگسی بلوچستان کی ایک ڈسٹرکٹ ہے۔ مگسی ایک قبیلے کا نام ہے اور چوں کہ وہاں یہی قبیلہ آباد ہے اور سب سے بڑا بلوچ قبیلہ ہے اس لیے وہ جھل مگسی یعنی مگسی قبیلے کی قیام گاہ کہلاتا ہے۔ اس علاقے کی وجہ شہرت پیر چتر ال شاہ نورانی اور موتی گوہرام مزار، جسے (بلوچستان کا تاج محل) بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پہ ایک بہت بڑا سمندر تھا جس کا ساحل بہت عرصے تک غیر آباد رہا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ساحل سے کافی دُور کچھ ریستوران کھل گئے اور سیاحوں نے بھی ادھر کا رُخ کرنا شروع کیا۔ مقامی لوگوں کو روزگار کا ذریعہ میسّر آ گیا۔ لوگ وہاں ریستورانوں تک تو آتے لیکن ساحلی علاقے کے قریب آنے کی کبھی کوشش نہ کرتے کیوں کہ اس علاقے سے عجیب وغریب کہانیاں منسوب تھیں۔ کسی نے وہاں ایک بڑے پتّھر کے پاس عجیب وغریب مخلوق کو دیکھا تھا جس کا چہرہ بے حد خوب صورت عورت کی طرح جب کہ نچلا دھڑ ایک بڑی مچھلی جیسا تھا۔ سنا ہے کہ وہ انسانوں کی بستی میں کافی آگے تک آجاتی تھی اور کسی کے دیکھ لیے جانے پہ سرکتی ہوئی ساحل سے قریب اس ویران مزار میں چلی جاتی جسے موتی گہرام کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور وہاں پہ موجود باشندوں میں سے کسی کو علم نہیں تھا کہ آنے والے وقتوں میں یہ ویران و بے آباد مزار بلوچستان کے تاج محل کے نام سے یاد کیا جائے گا اور اس کے نواحی علاقے کا نام جل پری کی نسبت سے ”جھل پری“ رکھ دیا گیا۔

مہا مچھلی! یہ جل پری کی پیشانی پہ مورپنکھ کیوں ہیں۔ ستارہ مچھلی نے اس دن اچانک مہا مچھلی سے پوچھا، جب وہ سب دائرے کی صورت میں مہا مچھلی کے ارد گرد گھومتے ہوئے کھیل کود میں مصروف تھیں اور ہماری پیشانی پہ ایسے پر کیوں نہیں ہیں؟ قرمزی مچھلی نے بھی مہا مچھلی سے سوال کیا اور مہا مچھلی، یہ ہمارے جیسی کیوں نہیں ہے۔ سرمئی مچھلی بھی

سوال کرنے میں پیچھے نہ رہی۔آخر رنگیلی مچھلیوں نے یکے بعد دیگرے وہ سب سوال پوچھ ہی ڈالے، جو ان کے دماغ میں اکثر و بیشتر کلبلاتے رہتے تھے۔مہا مچھلی جو خاموشی کے ساتھ ان کے کھیل تماشے کو دیکھ رہی تھی اسی ترتیب سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات دینے لگی۔جل پری کے ماتھے پہ لگے مور پنکھ ہی ہیں جو اس کو پانی سے باہر زمین پہ چلنے کی قوت دیتے ہیں۔زمین پہ چلنے پھرنے اور زندہ رہنے کی طاقت اسے ان دو پروں سے ملتی ہے پانی سے باہر آنے پہ سورج کی روشنی سے اپنے لیے طاقت کشید کرتے ہیں۔وہ انھیں بتانے لگی اور تم لوگوں کی پیشانی پہ ایسے پر اس لیے نہیں کہ تم لوگوں کو زمین پہ چلنے کا وصف عطاء نہیں کیا گیا اور یہ اسی لیے تم لوگوں جیسی نہیں اور تم لوگ اس جیسے نہیں ہو کیوں کہ قدرت نے ہر ذی رُوح کو ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے، کسی کو اگر ایک خوبی عطاء کی ہے تو دوسرے کو اس سے الگ کوئی ایسی خصوصیت عطاء کی گئی ہو گی جس سے دوسرا محروم ہو گا اور یہی قدرت کا اُصول ہے۔مہا مچھلی نے انھیں سمجھایا اور مہا مچھلی اگر کبھی میرے یہ پر ٹوٹ گئے یا کسی نے انھیں توڑ ڈالا تو کیا ہو گا۔اب کی بار جل پری نے خود سوال کیا۔مہا مچھلی کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی کہ اگر یہ پر ٹوٹ جائیں تو تم پانی سے باہر جا کے، زمین پہ پھر جی نہیں پاؤ گی کیوں کہ یہ پر چھن جانے سے زمین پہ جینے کا یہ وصف بھی تم سے چھین لیا جائے گا۔جل پری کو زمین سے عشق تھا۔وہ کسی قیمت پہ ان پروں کو کھونا نہیں چاہتی تھی اور یہ راز جان لینے کے بعد وہ اپنے ان پروں کی جان سے بھی زیادہ حفاظت کرتی تھی۔(کیا خبر تھی کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اسے ان پروں کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی)۔

اس جل میں وہ ایک ہی جل پری تھی لیکن جل میں رہنے والے انواع و اقسام سمندری جانور سب اس کے دوست تھے اور اس سے بہت پیار کرتے تھے۔جس طرح کسی بھی جگہ کا نظام سنبھالنے کے لیے ایک سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اس کا نظم و نسق درہم برہم ہو جاتا

ہے اس طرح جل کے تمام معاملات کو چلانے کی ذمہ داری مہا مچھلی پر تھی جو انتہائی تجربہ کار، عمر رسیدہ اور جہاندیدہ تھی۔ وہ جل محل کی ملکہ تھی اور تمام جل واسی جل محل کی خوب حفاظت کرتے تھے تاکہ دوسرے جل سے آنے والی سمندری مخلوق جل محل اور اس میں رہنے والوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ جل محل میں مہا مچھلی کا راج تھا جہاں جل پری، سمندری گھوڑا، کچھ سمندری کچھوے اور رنگیلی مچھلیاں رہتی تھیں جو کہ جل پری اور مہا مچھلی کے قریبی ساتھی تھے۔ مہا مچھلی کے عائد کردہ احکامات اور اُصول وضوابط کی تمام جل واسی پابندی کرتے تھے۔ ساری مچھلیاں جل پری کی گہری سہیلیاں تھیں۔ وہ سب اس پر رشک کرتی تھیں کیوں کہ ایک تو وہ جل محل کی رانی تھی دوسرا وہ سمندر پار ساحل تک آتی جاتی تھی۔ وہ ساحل سے واپس آ کر مدھ بھری خوب صورت باتیں کرتی تھی۔ انسانوں کی باتیں، ان کے چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور لباس کی باتیں، کیوں کہ اس ساحل سے کچھ ہی دُور لوگ سیر وتفریح کی غرض سے آتے تھے اور وہ ان کی نقل وحرکت کو بہت دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔ وہ جب بھی ساحل سے ہو کر آتی۔ جل اسے بُرا لگنے لگتا۔ رنگیلی مچھلیاں، سبز اور سیاہ وسفید سمندری کچھوے، جن کے ساتھ ویسے وہ بہت مزے سے کھیلتی تھی لیکن ساحل سے واپس آ کر عجیب سی اُداسی اسے گھیر لیتی تھی۔

سمندری گھوڑا اس کا دل لبھانے کی کوشش کرتا۔ ننھی رنگیلی مچھلیوں کا ٹولہ اس کے اردگرد رقص کرنے لگتا، ان کے نغمے سارے جل میں گونج رہے ہوتے مگر اسے آواز ہی کہاں آتی۔ وہ تو اپنا سب کچھ اس بھیگے ساحل پہ چھوڑ کے آجاتی تھی۔ جہاں اسے من موہنی سی صورت اور خوب صورت باتیں کرنے والا ایک آدم زاد بھا گیا تھا۔ اس نے مہا مچھلی سے انسانوں کی بستی کی بہت سی کہانیاں سُن رکھی تھیں اور وہ نئی نئی دنیائیں کھوجنے کی شوقین یہی سب دیکھنے کے لیے ساحل پہ آتی تھی۔ اسے عجیب سی کشش اپنی جانب کھینچتی تھی۔

وہ جل سے باہر آتے ہی جا بجا بکھری چمکیلی ریت سے اپنا جسم سکھاتی پھر ایک بڑے پتّھر کے پیچھے چھپ کر وہاں سے دُور ساحل پہ موجود آدم زادوں کو دیکھا کرتی تھی۔ وہ بہت مدھر گاتی تھی۔ گانا تھا کہ سوز و گداز میں لپٹی لہروں کا ترنم جس کی تال میل ایک اجنبی سے جڑ گئی تھی۔ وہ اسے بڑے پتّھر کے کنارے بے ہوش پڑا ملا تھا کیوں کہ ساحل کے اتنے قریب کوئی بھی نہیں آتا تھا۔ وہ شاید راستہ بھٹک کے یہاں آ گیا تھا۔ وہ نہایت آہستگی کے ساتھ اسے ہوش میں لانے لگی۔ اسے مہا مچھلی کی تمام ہدایات اس وقت بھول چکی تھیں کہ اسے کبھی بھی کسی آدم زاد کے قریب نہیں جانا اور یاد تھا تو فقط اتنا کہ اسے ہوش میں کیسے لانا ہے بالآخر اس کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور وہ ہوش میں آ گیا۔ اس کی بَل کھاتی دم میں جمع شدہ پانی کے نرمل چھینٹے اسے ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ حیران سا ہو کر اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اب گھبرانے کی باری اس کی تھی۔ وہ بَل کھا کر ایک ہی پَل میں ساحل کی ریت سے پھسل کر جل کے اندر چھپ جاتی مگر بُرا ہو اس کی دُم کا، جو عین اس وقت اس کے سامنے آ گئی جب وہ جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں پہلی بار کسی جل پری کو دیکھ رہا تھا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو آدھے دھڑ والی انسانی شکل و صورت کی عورت کو دیکھ کر ضرور خوفزدہ ہو جاتا مگر اس نے جل پری کے بہت سے قصّے سُن رکھے تھے اور سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ بھی لے گا۔ اس کی نظریں جیسے اس پہ جم کر رہ گئیں۔

اس نے پوچھا! کیا تم جل پری ہو؟ ہاں... میں جل پری ہی ہوں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ وہ دونوں حیرت بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کیا تم اس جل میں رہتی ہو؟ کچھ دیر کے سکوت کے بعد آدم زاد نے سوال کیا۔ جل پری نے اثبات میں سر ہلا دیا اور تم... کیا... آدم زاد ہو؟ ؟ اس کے منہ سے دبی دبی آواز نکلی۔

ہاں... آدم زاد... اسے اس کے لفظ آدم زاد کہنے پہ بے اختیار ہنسی آ گئی (شکر ہے آدم خور نہیں کہا گیا) مگر تم ساحل کے اتنے قریب کیا کر رہے تھے؟ جل پری نے پوچھا! وہ اسے بتانے لگا، میں دراصل اپنے دوستوں کے ساتھ ساحل سمندر کی سیر کے لیے آیا تھا پھر وہ لوگ ساحل سے کافی ہٹ کے بنے ایک ہوٹل سے ہی گھوم پھر کے سمندر کا نظارہ کرنے لگے لیکن مجھے سمندر کو قریب سے دیکھنے کا شوق چرایا اور میں یہاں اس پتّھر پہ بیٹھا آتی جاتی لہروں سے کھیل رہا تھا کہ یکا یک ایک تیز لہر مجھے اپنے ساتھ بہا کر لے گئی لیکن شاید ابھی زندگی باقی تھی کہ دوسرے ہی ریلے نے مجھے واپس ساحل پہ پٹخ دیا اور میرا سر اس پتّھر سے آ ٹکرایا۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں۔ اس کی بات سُن کر جل پری بولی! ہاں سمندر کی مہان لہروں نے تمہاری جان بخش دی ورنہ جل نگری میں داخل ہونے والا کم ہی وہاں سے واپس آتا ہے۔ وہ دونوں اسی پتّھر پہ بیٹھ گئے اور ڈھیر ساری باتیں کیں۔ جل پری اسے اپنے بارے میں سب بتانے لگی اور وہ اس کی ذات سے جڑے پُر اسرار رازوں کے بارے میں بہت دلچسپی سے سننے لگا پھر وہ اسے اپنے بارے میں بتانے لگا کہ اسے نئی نئی جگہیں اور عجائبات دیکھنے کے شوق اور لگن نے بعض اوقات بہت بڑے بڑے خطرات اور مسائل سے دو چار کیا ہے اور جب جل پری نے اسے بتایا کہ وہ انسانی دنیا کے لوگوں کو دیکھنے کے شوق میں کئی بار اسی پتّھر کی آڑ میں بیٹھی رہی ہے اور دُور دُور سے دیکھ کر ہی اسے انسانوں کے بارے میں بہت سی باتوں کا اندازہ ہو گیا تو وہ یہ سب سُن کر بہت محظوظ ہوا۔ اس کی خوب صورتی اور من موہنی صورت یکبارگی اس کے دل میں گھر کر گئی اور یوں اس پہلی مُلاقات میں ہی وہ دل ہار بیٹھا تھا جل کی رانی کے سامنے اور وہ بھی مبہوت سی ہو کے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

’’جل پری‘‘ (حصّہ 2)

اس کا نام ضرار بن ہشام تھا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا فرزند تھا۔ والد کی کنسٹرکشن کمپنی تھی۔ پیشے سے انجینئر ہوتے تھے۔ پکّے پروفیشنل انسان تھے۔ ایک ایک پائی کا حساب رکھنے والے اور جوڑ جوڑ کر پیسہ بنانے والے۔ اکلوتی اولاد ہونے کے باوجود کھینچ تان کر ہی خرچ کرتے۔ ضرار کی والدہ کا اس کے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ پہلے پہل دادی نے دیکھ بھال کی مگر وہ بھی شہر میں رہنے کی عادی نہ تھیں اور جلد ہی واپسی کی راہ سدھاری۔ ان کے بے حد اصرار پہ بھی، نہ وہ شہر رُک سکیں اور نہ ہی ضرار کو اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش کے باوجود دونوں باپ بیٹا راضی ہوئے کیوں کہ ضرار اس وقت تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔

زندگی جانے والوں کے ساتھ رکتی نہیں ہے بلکہ آگے ہی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ اس کے گھر میں بھی کچھ عرصے میں اس کی سوتیلی ماں اور دو بھائی بھی آ گئے۔ وہ آنے والے وقتوں میں بس ان ماں بیٹوں کے عتاب کا ہی نشانہ بنتا رہا اور اس نے زیادہ وقت گھر سے

باہر گزارنا شروع کر دیا۔ چھوٹے دونوں بھائی اس کے ہم عمر ہی لگتے تھے۔ زمانے کے سرد وگرم سہتے سہتے زندگی نے اسے کافی کچھ سکھا دیا تھا۔ اپنے سے جڑے رشتوں کی خودغرضی نے کچھ ہی عرصہ میں اسے ان سے بہت دُور کر دیا۔ اس نے بھی باپ کی خواہش پر انجینئرنگ میں داخلہ لیا لیکن وہ گھر اور گھر والوں سے فرار کی خاطر سیاحتی گروپوں کے ساتھ دُور دراز علاقوں میں جایا کرتا۔ باپ نے بھی اس کا شوق دیکھ کر منع نہ کیا۔ ویسے بھی ماں کی وفات کے بعد وہ اس کے اکیلے پن سے واقف تھے۔

اس کا باپ فارن کمپنیز کے لیے کنسٹرکشن کے کام کرتا تھا اور کئی منصوبے کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچا دیے تھے اور کئی زیرِ تکمیل تھے۔ آج کل وہ ایک ایسی کمپنی کے ساتھ منسلک تھے، جو دُور دراز، غیر آباد علاقوں کو تلاش کرتی اور اس پہ ریسٹ ہاؤس اور ہوٹل وغیرہ تعمیر کرتی، جس کی وجہ سے بعد میں وہاں بھی زندگی کا دور دورہ ہو جاتا۔ کچھ ہی عرصے میں اس کے باپ کا کام اور نام بین الاقوامی سطح پر مشہور ہو گیا۔ وہ اب ضرار کو بھی مختلف کمپنیوں کے ساتھ اِدھر اُدھر بھیجتے تھے۔

گزشتہ سال بھی انھوں نے ایک غیر ملکی کمپنی کے ساتھ ایک غیر آباد ساحل سمندر کے قریب ریسٹ ہاؤس بنانے کا ایگریمنٹ سائن کیا تھا جو کہ ضلع جھل مگسی میں واقع تھا۔ اس مرتبہ اس تمام پراجیکٹ کی ذمہ داری ضرار کے حوالے تھی۔ وہ دفتری معاملات کے ساتھ ساتھ باقی سارا وقت اس ساحل سمندر پہ گزارتا تھا۔ پوری ٹیم کو مختلف کام سمجھاتا ہوا وہ اکیلا سمندر کے بہت قریب آگے تک نکل جاتا۔ اسے عجیب سی کشش اپنی جانب کھینچتی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کا کام تقریباً مکمل ہونے والا تھا۔ وہ جب بھی ساحل سمندر کے قریب آ کر کھڑا ہوتا تو نہ جانے کیوں عجیب سا احساس ہوتا۔ ایسا لگتا کہ کوئی ہے یہاں... جو چھپ چھپ کے اسے دیکھ رہا ہے۔ اس دن بھی وہ ہر جگہ کام کے معائنے کے بعد وہاں موجود کارکنان کو ضروری ہدایات

دینے کے بعد ساحل کی طرف آنکلا۔ادھر سے ادھر چہل قدمی اسے بہت مزہ دے رہی تھی۔ وہ دُور تلک سمندر کی لہروں کا پیچھا کرتے ہوئے کافی آگے آنکلا۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں ڈوبا تھا کہ پانی کی آتی جاتی لہروں میں سے ایک زوردار سی لہر سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اوراس سے قبل کہ بہاؤ کے ساتھ پانی کے اندر چلا جاتا۔ایک تیز دھار لہر نے اسے واپس ساحل پہ پٹخ دیا اوراس کا سر پوری شدت سے ساحل سمندر پہ پڑے ایک بھاری پتّھر سے ٹکرایا، وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔نہ جانے وہ کتنی دیر وہاں بے یارومددگار پڑا رہا اور اگر وہ کچھ دیر اور وہاں رہتا تو یقیناً کسی نہ کسی سمندری درندے کی خوراک بن جاتا لیکن جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے کسی کو اپنے اُوپر جھکے پایا۔وہ اس پہ پانی کے چھینٹے پھینک رہی تھی۔اسے کسی انہونی کا احساس ہورہا تھا۔وہ اسے بغور دیکھنے لگا۔

''جل پری'' (حصّہ 3)

کرۂ ارض کے ایک حصّے میں موجود اس لامتناہی سمندر میں چھوٹے بڑے، خطرناک، بے ضرر ہر طرح کے سمندری جانور موجود تھے۔ جس طرح آسمان پہ موجود مزید سات آسمان اور اس کی لامحدود وسعتوں میں پھیلی لاتعداد دنیائیں ہیں اسی طرح سمندر بھی اپنے اندر اَن گنت مخلوق سمیٹے ہوئے ہے۔ لہٰذا یہ سمندر بھی مختلف حصوں پہ مشتمل تھا۔ سب سے اُوپر والے حصّے میں جل محل تھا۔ جس کی ملکہ مہا مچھلی تھی اور اس کے ساتھ جل پری اور سمندر کے باقی وفادار ساتھی تھے۔ اس سمندر میں لاتعداد سمندری جانور اپنے اپنے مخصوص حصّے میں قیام پزیر تھے۔ ان ہی میں سمندری چیتا، سمندری شیر، سمندری ہاتھی کے علاوہ آٹھ ہاتھوں والا انتہائی خطرناک آکٹوپس بھی تھا۔ جل میں رائج کردہ اُصولوں کی پابندی تقریباً سب ہی چھوٹے بڑے سمندری جانور کرتے تھے اور اگر سمندری جانوروں کے مابین کسی بھی قسم کی چپقلش ہوجاتی تو معاملہ مہا مچھلی کے دربار میں پیش کیا جاتا تھا۔

مہا مچھلی! کچھ جل واسی آپ کے دربار میں پیش ہونا چاہتے ہیں۔مہا مچھلی اپنے محل میں جل پری کے ہمراہ محو استراحت تھی کہ سمندری خرگوش تیرتا... چھلانگیں لگاتا مہا مچھلی سے گوش گزار ہوا۔جل واسیوں کا یوں جل محل میں آنا اور مہا مچھلی سے ملنا روز مرّہ کے معمولات کا حصّہ تھا۔اس لیے مہا مچھلی نے حسبِ معمول آنے والوں کا سواگت کیا۔اس سے ملنے،کوسمک مچھلی اور آتش فشاں مچھلی آئیں تھیں۔یہ دونوں اسی جل کے ایک حصّے میں رہتی تھیں اور نسبتاً بہت دوستانہ اور امن پسند مچھلیاں تھیں۔کوسمک مچھلی کی شکل کسی چھوٹی سی طشتری سے مشابہہ تھی جب کہ آتش فشانی مچھلی کے جسم پر بال نما ابھار تھے۔جب وہ سمندر کی لہروں سے ٹکراتی تھی تو قوس وقزح کے رنگوں والی روشنیاں اس کے جسم سے پھوٹتی تھیں۔مہا مچھلی کو دونوں ہمجولیوں کا ایک ساتھ جل محل میں آنا یقیناً تشویش میں مبتلا کر گیا۔خیریت تو ہے نا مچھلیو! تم لوگ پریشان دکھائی دے رہی ہو؟ مہا مچھلی نے دریافت کیا۔کوسمک مچھلی نے آتش فشانی مچھلی کی طرف دیکھ کر کہا مہا مچھلی...!بات کچھ یوں ہے کہ رات میں فلیمی سنیل بغیر اجازت ہمارے گھر میں داخل ہوئی اور ادھر ادھر اگے تمام پودے خراب کر دیے۔فلیمی سنیل دراصل زہریلے پودے کھاتی تھی اور صرف زہریلے پودے کھانے کی وجہ سے خود بھی نہایت زہریلی ہوگئی تھی۔اس لیے اسے کوئی بھی نہیں کھاتا تھا مگر اس کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔اب کے مہا مچھلی نے حیرت سے دریافت کیا۔یہی تو ہمیں نہیں معلوم مہا مچھلی وہ تو صرف زہریلی چیزیں کھاتی ہے پھر ہمیں اسی بات پہ حیرانی ہے کہ وہ ہمارے گھر میں کیا لینے آئی تھی۔مہا مچھلی نے اسے جل محل میں پیش ہونے کا حکم نامہ جاری کر دیا۔

مہا مچھلی کے حکم پر رابن فش،فلیمی سنیل کے زہریلے جل کی طرف روانہ ہوئی تا کہ فلیمی سنیل کو جل محل میں آنے کا حکم نامہ سنا سکے۔رابن فش صاف ستھرے پانی میں رہنے والی خوب صورت مچھلی تھی جس کے دائیں بائیں تتلیوں جیسے پر تھے۔اس کے باوجود وہ

اپنے تیلی نما پیروں کی مدد سے سمندر کے فرش پہ چلتی پھرتی تھی۔ رابن فش زہریلے جل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ جل کے قریب پہنچ کر اس نے باآوازِ بلند پکارا... فلیمی! تم کہاں ہو...؟؟ فلیمی جو گھنے زہریلے پودوں میں سر دیے اپنے لیے خوراک کشید کر رہی تھی۔ رابن فش کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گئی کیوں کہ اس کے زہریلے گھر کے قریب کوئی نہیں آتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ فلیمی سنیل بری یا خطرناک تھی لیکن اس بے چاری کے ساتھ مسئلہ یہی تھا کہ وہ صرف زہریلی چیزیں کھانے کی وجہ سے خود بھی زہریلی ہو چکی تھی اس لیے جہاں کہیں زہریلے پودوں کی بہتات ہوتی اسے ہی اطلاع دی جاتی، جس سے نہ صرف اس کی خوراک پوری ہو جاتی بلکہ جل زہریلی جڑی بوٹیوں سے پاک ہو جاتا۔ جتنی وہ زہریلی تھی اتنی ہی دل کی صاف اور دوسروں کی مددگار تھی یہاں تک کہ جب اس کے زہر سے جل کا پانی گدلا ہونے لگا اور کچھ جل واسی مر گئے تو مہا مچھلی نے اسے کسی بھی طرح اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کہا دوسری صورت میں اسے جل بدر کر دیا جاتا کیوں کہ سب جل واسیوں کی صحت و زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا تو ایسے میں کام آئی سمندری مکڑی... جس نے فلیمی سنیل کی رہائش گاہ کے اردگرد ایسا جال بن دیا جس سے زہریلا پانی باقی جل کے پانی کے ساتھ ملتا نہیں تھا بلکہ جال کی وجہ سے کشید ہو جاتا تھا۔ یوں فلیمی سنیل جل بدری سے تو بچ گئی لیکن اسے جل میں عام گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں تھی اور جہاں کہیں بھی اسے زہریلی بوٹیوں کی صفائی کے لیے بھیجا جاتا، پہلے سمندری مکڑی اس کے اردگرد جال بن لیتی تھی۔

رابن فش کی آواز سُن کر فلیمی چونک گئی کیوں کہ یہاں جب بھی کوئی آتا تھا اسے کسی نہ کسی کام کا ہی کہا جاتا تھا۔ خیریت تو ہے نارابی... تم آج کیسے زہر جل کی طرف کا راستہ بھول گئی۔ فلیمی نے رابن فش کو پیار سے پکارا۔ دراصل تمہیں مہا مچھلی نے جل محل میں بلایا ہے۔ رابن نے اسے بتایا۔ کیا کسی جگہ کی صفائی کرانی ہے...؟ فلیمی کی چاہت تو تب ہی من میں جاگے

جب کہیں کی صفائی ستھرائی کروانی ہو،اس نے رنجیدہ سے لہجے میں کہا۔ارے نہیں... مجھے مہا مچھلی نے بھیجا ہے یہاں کہ تم ابھی فوراً میرے ساتھ چلو،تمہیں جل محل میں بلایا ہے۔فلیمی کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔کیا میرے خلاف کسی نے کوئی شکایت کی ہے مگر میں نے تو کچھ نہیں کیا۔رابن نے کہا کہ یہ تو وہاں جا کے ہی پتا چلے گا،فی الحال تو میرے ساتھ چلو۔فلیمی کے جانے کا سُن کر سمندری مکڑی نے جلدی سے فلیمی کے ارد گرد جال بن دیا۔

جل محل میں مجلس لگی تھی۔ایک طرف مہا مچھلی بہت بڑے سمندری تخت پہ جل پری کے ہمراہ براجمان تھی۔سامنے کوسمک مچھلی اور قوس وقزح آتش فشاں مچھلی اور دوسری طرف فلیمی سنیل مجرم بنی کھڑی تھی۔فلیمی...! کیا تم اس بات کی وضاحت کرو گی کہ تم رات میں کوسمک اور قوس وقزح مچھلی کی رہائش گاہ پر کیا کرنے گئی تھی...؟ مہا مچھلی نے پوچھا،فلیمی یہاں جل محل میں پہنچتے ہی سمجھ گئی تھی کہ کیا معاملہ ہے جیسے ہی اس کی نظر کوسمک اور قوس و قزح مچھلی پہ پڑی تھی۔مہا مچھلی! بات دراصل کچھ یوں ہے کہ مجھے ان کی رہائش گاہ کے قریب سے گزرتے ہوئے زہریلی جڑی بوٹیوں کی خوشبو آئی تھی اور اس وقت میں اگر وہاں فوراً نہ جاتی تو وہ زہر ان کی رہائش گاہ کو زہریلا بنا دیتا اس لیے میں بغیر اجازت فوراً اندر داخل ہوگئی اور ان کو ایک ایک کر کے کھانا شروع کر دیا اور جس وقت تک یہ وہاں پہنچیں تو میں ساری بوٹیاں کھا چکی تھی اور یہ جس ساز وسامان کے خراب ہونے کا الزام لگا رہی ہیں وہ میری وجہ سے نہیں بلکہ اچانک اُگ آنے والی ان زہریلی جڑی بوٹیوں سے ہوا ہے۔کوسمک اور قوس وقزح مچھلی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں اور یوں بھی میں جیسے ہی اپنی قیام گاہ سے باہر نکلتی ہوں تو اسی وقت سمندری مکڑی... میرے اطراف میں جال بن دیتی ہے۔فلیمی مزید بولی۔مانتی ہوں کہ میرے اندر زہر بھرا ہے مگر میں نے آج تک کسی کو نقصان دینے کا سوچا بھی نہیں ہے بلکہ جہاں تک ہو سکا سب کی راہ کے کانٹے دُور کیے...لوگوں کے راستے

سے زہریلی جڑی بوٹیاں صاف کرتے کرتے... میں خود اس قدر زہریلی ہوگئی کہ اب مجھے اپنے قریب سے بھی کوئی نہیں گزرنے دیتا۔ وہ بولتے بولتے دکھی ہوگئی۔ مہا مچھلی نے غصیلی نظروں سے کوسمک اور قوس وقزح مچھلی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں بے انتہا شرمندہ ہوگئیں۔ نہ صرف مہا مچھلی اور فلیمی بلکہ پورے جل کے سامنے ان کی بہت سبکی ہوئی اور اَب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ فلیمی سے معذرت کرتیں اور مہا مچھلی سے بھی معافی مانگتیں کہ انھوں نے بنا تصدیق کیے اور بغیر کسی ثبوت کے، فلیمی کے ایک اچھے عمل کو سراہنے کے بجائے اس پہ الزام دھر دیا تھا کہ وہ آج نہ صرف دکھی ہوئی بلکہ ان کی اپنی بھی سارے جل واسیوں کے سامنے بے عزتی ہوگئی۔ مہا مچھلی نے سمجھا بجھا کے اور دلاسہ دے کے فلیمی کو رخصت کر دیا۔ کوسمک اور قوس وقزح بھی دل پر بوجھ لیے جل محل سے واپس جا رہی تھیں۔ مہا مچھلی سوچ رہی تھی کہ اگر فلیمی اور اس کا خاندان اس جل میں نہ رہا ہوتا تو آج یہ سارا جل زہریلی جڑی بوٹیوں کی آماجگاہ ہوتا۔

گہرے سمندر کے حیرت انگیز باشندے جہاں بے حد مضبوط اور طاقتور تھے، اپنی اپنی مخصوص قیام گاہ میں اپنے پورے پورے خاندانوں کے ساتھ آباد تھے۔ تیس تیس، چالیس چالیس ٹن کے عفریت شارک، جن کے بڑے بڑے جبڑے دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ بڑے جانور موقع ملتے ہی چھوٹے جانوروں کو کھا جاتے تھے۔ پھر معاملہ مہا مچھلی کے سامنے پیش کیا جاتا۔ صرف سمندری کرل اور چھوٹی مچھلیاں کھانے کی اجازت تھی جن کی زندگی ہی چار دن کی ہوتی تھی اور وہ ہی تمام آبی مخلوق کی خوراک تھے۔ سمندر میں آبی مخلوق کی سیکڑوں اقسام موجود تھیں۔ جن میں سے ایک دیوہیکل نیلی ویل مچھلی بھی تھی۔ ویل دنیا کی سب سے دیوقامت سمندری جانور ہونے کے باوجود بڑے سمندری جانوروں کا شکار کرنے سے کتراتی تھی اور صرف چھوٹی مچھلیاں اور کرل کھاتی تھی۔ ان جل واسیوں میں ایک اینگلر

فش بھی تھی جس کے سر پہ اینٹینا نما کانٹا تھا جو بلب کی طرح چمکتا تھا اور شکار کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔اس کی چمکدار روشنی شکار کو اپنی طرف لبھاتی تھی۔اسی کرہ ارض کے سب سے نچلے حصّے کی بہت خوفناک رہائشی قطرہ مچھلی تھی جس کی آنکھیں چھوٹی تھیں۔

''جل پری'' حصّہ(4)

قطرہ مچھلی انتہائی بدہیئت اور نک چڑی تھی اور اپنے پورے خاندان کے ساتھ سمندر کے نچلے حصّے میں آباد تھی۔اس کے ساتھ والے حصّے میں سمندری کیکڑا رہتا تھا جو بہت گہرے پانی میں رہنا پسند کرتا، جسے صرف پورے چاند کی راتوں میں اُوپر دیکھا جاتا، جب سمندری لہریں اپنے عروج پہ ہوتی تھیں۔ پتا نہیں سمندر کی گہرائیوں میں رہنے والے اس کیکڑے کا چودھویں کے چاند سے کیا تعلق تھا کہ جیسے ہی پورا چاند اپنے جوبن پر ہوتا اس وقت عجیب سا سماں ہوتا، نہ صرف سمندر میں ہونے والے مدوجذر تیز ہو جاتے بلکہ ایسا محسوس ہوتا کہ سمندر کی لہریں لپک لپک کر چاند کو چھونے کی کوشش کر رہی ہیں۔ایسے میں اچانک کہیں سے سمندری کیکڑا زمین کی تہہ سے نمودار ہو جاتا اور دودھیا چاندنی میں نہائے سمندر سے باہر آ کر چاند کی طرف لپکنے کی کوشش کرتا تھا اور ایسے میں جھالردار مچھلی بھی اپنی پوری جھالر کو پھیلا کر رقص کرتی تھی اور یہ اس کے خوش ہونے کی علامت ہوتی تھی۔ چاند کے ڈوبتے ہی اس کے

جھالر دار پرکسی چھتری کی طرح بند ہو جاتے۔اس کے علاوہ وہاں سمندری لال بیگ بکثرت پائے جاتے تھے اور ان کا کوئی مخصوص ٹھکانہ نہ تھا بلکہ یہ سمندر کے ہر حصّے میں اِدھر اُدھر دندناتے پھرتے تھے۔

اسی سمندر کے ایک حصّے میں سمندری ڈریگن، کیکڑے اور آکٹوپس تھے اور ہر ایک اپنے اپنے مخصوص حصّے میں اپنے اپنے خاندان کے ساتھ رہ رہا تھا لیکن ان سب میں سے ایک آکٹوپس بہت زہریلا، بدہیبت اور خطرناک تھا۔جس کی پورے جل میں کسی سے نہیں بنتی تھی اور جیسے ہی اسے موقع ملتا وہ ہر ایک کو حتّی المقدور زچ کرنے کی کوشش میں لگا رہتا۔ جل میں موجود چھوٹا بڑا، بے ضرر، خطرناک ہر ایک جاندار آکٹوپس سے تنگ تھا کیوں کہ وہ جل میں رائج کردہ اُصول توڑنے میں ماہر تھا بلکہ اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا۔ سارے جل واسیوں کی اس سے متنفر ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ اگر ننھی منی مچھلیوں اور کرل کھا کر اس کا پیٹ بھر بھی جاتا لیکن اس کی بدنیتی اور لالچ اسے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ وہ بڑی طاقتور مچھلیوں سے لے کر رنگیلی مچھلیوں تک کو چٹ کر جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ساحل سمندر سے انسانوں کو بھی گھسیٹ کر لے آتا اور انھیں اپنی خوراک بنالیتا تھا لیکن زیادہ تر اس کا شکار رنگیلی مچھلیاں ہی بنتی تھیں۔

آکٹوپس اور بعض دوسرے سمندری جانوروں کے اس ظلم سے تنگ آ کر ایک دن رنگیلی مچھلیوں نے جل پری کو کہا...جل پری...! تم مہا مچھلی کے سامنے ہمارے لیے فریاد کرو کہ یہ سب بڑے سمندری جانور، خاص طور پر آکٹوپس ہم چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتے ہیں جس کی وجہ سے ہر وقت ہماری جان کو خطرہ لاحق رہتا ہے لہٰذا اس ظلم کو ختم کیا جائے۔جل پری بولی، پیاری سکھیو! میں ہر صورت مہا مچھلی کے دربار میں تم لوگوں کی عرضی پیش کروں گی اور جل پری نے اپنے وعدے کے مطابق رنگیلی مچھلیوں کی فریاد مہا مچھلی کے سامنے پیش کی۔

مہا مچھلی سوچ میں پڑ گئی۔ (سب جل واسی پھر کھائیں گے کیا۔۔؟) لیکن پھر بھی فیصلہ رنگیلی مچھلیوں کے حق میں ہو گیا۔ جس نے تمام کائنات تشکیل دی، جو ہر ایک کی روزی روٹی کا ذمہ دار ہے۔ وہ ہی ان کے پیٹ بھرنے کا بندوبست بھی کرے گا لیکن وہ ان معصوموں کی عرضی رد نہیں کرے گی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب مہا مچھلی نے یہ اعلان کیا کہ آئندہ کوئی بھی جل واسی کسی چھوٹی مچھلی کو نہیں کھائے گا تو سب جل واسی ششدر رہ گئے کہ پھر وہ اپنی بھوک کیسے مٹائیں گے کیوں کہ پہلے پہل سب جل واسی چھوٹی اور کمزور مچھلیوں کو سمندر میں اُگی جڑی بوٹیوں کے ساتھ ملا کے کھاتے تھے اور ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی تھی اور مہا مچھلی نے ان کی عرضی مان کے یہ حکم صادر کر دیا کہ اب تمام جل واسی صرف جل میں اگی مختلف جڑی بوٹیاں ہی کھائیں گے اور کوئی بھی کمزور اور چھوٹی مچھلیوں پہ ہاتھ نہیں ڈالے گا جو اپنے دفاع کی سکت بھی نہیں رکھتیں اور ہر ایک نے اس حکم پر سر تسلیم خم کیا۔ بھوک ایک جبلت تھی۔ گوشت کی اشتہا ابھی بھی۔۔ بہت سوں کو ترغیب دیتی تھی مگر قانون اور اُصول وضوابط کا احترام بازی لے گیا۔ کمزور اور معصوم کا احساس مزید پیار ومحبت میں بدل گیا اور جب قانون کی بالادستی ہو۔ ہر ایک کی جان کی حفاظت کی جا رہی ہو تو رحمت خداوندی برسنے میں بس کچھ ہی وقت لگتا ہے۔ شاید کسی کو یقین نہ آتا کہ اس اُصول کے لاگو ہونے کے بعد جب گوشت کی بھوک اور اشتہا تمام جل واسیوں کو تنگ کرنے لگی لیکن کسی نے رائج کردہ قانون کی خلاف ورزی نہ کی تو انعام میں جل واسیوں کو وہ عطاء کر دیا گیا جس کا وہ گمان بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سمندر میں ایسی جڑی بوٹیاں اگنے لگیں جن کی شکل ننھی منی مچھلیوں جیسی تھی۔ وہ رنگ برنگی جڑی بوٹیاں اس قدر خوب صورت کہ دیکھنے میں رنگیلی مچھلیوں کے جھنڈ کی مانند دکھائی دیتیں۔ سب سے پہلے ان جڑی بوٹیوں کو توڑ کے کھانے والی جل پری ہی تھی اور وہ بھاگ بھاگ کے مہا مچھلی کو خبر

دینے آئی تھی کہ ان جڑی بوٹیوں کی نہ صرف شکل چھوٹی مچھلیوں جیسی ہے بلکہ ان کا ذائقہ بھی گوشت جیسا ہے۔ یہ خبر سُن کے سارا جل خوشی سے جھوم اُٹھا پھر تو سارے جل واسی ان عجیب و غریب ماہیت کی جڑی بوٹیوں پر ٹوٹ پڑے جس میں گوشت اور جڑی بوٹیوں... دونوں کا ذائقہ تھا۔ سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ جل واسی بے حد خوش تھے لیکن اُداس بھی... آنے والے کل کی بھوک کے خوف سے... اس جگہ پر موجود چھوٹے چھوٹے قد کے جھنڈ گوشت کے درخت لگ رہے تھے جن کے بارے میں مہا مچھلی نے بتایا کہ یہ شجرِ لحم ہیں جو انصاف پسندی، رحم دلی اور قانون کی پیروی کرنے کی وجہ سے انعام کے طور پہ یہاں قدرت کی طرف سے اُگ آئے ہیں اور جب تک قانون کی بالادستی، عدل و انصاف اور رحم دلی کا نظام رائج رہے گا یہ ایسے ہی نعمت بن کے جل واسیوں کو ملتے رہیں گے مگر کسی قسم کی زیادتی اور لاقانونیت تمام جل واسیوں کو اس سے محروم کر دے گی۔ پھر وہ شجرِ لحم ان کے لیے من وسلویٰ کی طرح خود بخود اُگتے رہے۔ جل میں ننھی منی رنگیلی مچھلیوں کی بہتات ہوگئی تھی۔ رنگیلی مچھلیوں اور دوسری کمزور سمندری مخلوق کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیوں کہ ان کی جان کو اب کوئی خطرہ نہ تھا لیکن یہ ان کی بھول تھی۔ کوئی تھا جو ابھی بھی ان کی جان کے درپے تھا۔

جل پری اپنی ہم جھولیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی کہ دو رنگیلی مچھلیاں شدید گھبراہٹ کے عالم میں وہاں آگئیں۔ کیا ہوا رنگیلی مچھلیو...! خیر تو ہے... کیوں اتنی گھبرائی ہوئی ہو۔ جل پری نے ان سے پوچھا۔ وہ بولیں، جل پری! ہم سب کی جان ابھی بھی ہر وقت خطرے میں ہے۔ رنگیلی مچھلیوں میں سے ایک نے تیزی سے کہا مگر اب کیا ہوا ہے۔ اب تو مہا مچھلی کے حکم کے مطابق کوئی بھی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ نہیں جل پری، باقی تمام جل واسی تو پوری طرح اس قانون کی پاس داری کر رہے ہیں لیکن ابھی بھی وہ ناہنجار زہریلا آکٹوپس نہ صرف رنگیلی مچھلیوں کو... بلکہ جو اس کے قابو میں آتا ہے، اسے کھا لیتا ہے۔ انھوں نے اسے

بتایا۔جل پری۔۔۔!اب تمہیں ہی پھر ہمارے لیے کچھ کرنا ہوگا۔جل پری یہ روئیداد سُن کر گہری سوچ میں پڑ گئی اور اس نے سوچ لیا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

وہ اگلے کچھ ہی پل میں چند رنگیلی مچھلیوں کی ہمراہی میں جل کے اس حصّے میں موجود تھی جہاں زہریلا آکٹوپس اور چند دوسرے خطرناک سمندری جانور مقیم تھے۔جل پری کی اس حصّے میں آمد یقیناً غیر معمولی تھی۔سمندری کیکڑا انھیں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔۔۔خیریت تو ہے جل محل کی شہزادی اور ہمارے غریب خانے پہ۔۔۔رنگیلی مچھلیاں جل پری کے پیچھے چھپنے لگیں۔ کیا تم سب کو مہا مچھلی کے جاری کردہ حکم کے بارے میں علم ہے۔جل پری نے پوچھا، جی جی مہارانی! نہ صرف علم ہے بلکہ ہم سب اس پہ پوری طرح عمل پیرا بھی ہیں اور اَب تو اس کی ضرورت بھی نہیں رہی کیوں کہ قدرت نے ایسے مزے دار شجر لحم سے نوازا ہے کہ رنگیلی مچھلیوں کا ذائقہ ان کے سامنے کچھ بھی نہیں لیکن کوئی تو ہے جو اس قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔اب کے جل پری نے سوال کیا۔جل کی رانی! ایسا صرف وہ بدشکل اور بدہیبت آکٹوپس ہی کرتا ہے۔

اگرچہ کہ باقی کسی سمندری جانور یا آکٹوپس نے کسی بھی کمزور سمندری مخلوق کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔اگر پہلے کوئی کچھ کرتا بھی تھا تو مہا مچھلی کے حکم کے بعد اور خاص طور پر شجر لحم کی فراہمی کے بعد تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ہم سب اس کی ان حرکتوں سے بہت تنگ ہیں اس نے ہماری ناک کٹوا دی ہے۔سمندری کیکڑے نے شرمندگی سے وضاحت کی۔زہریلا آکٹوپس اندر چھپا ساری گفتگو سُن رہا تھا۔اس نے جل پری کے بارے میں سُن رکھا تھا مگر قریب سے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔اس کی خوب صورتی کو دیکھ کر گنگ رہ گیا اور دل ہی دل میں عہد کیا کہ کوئی حیلہ حربہ کر کے اس حسن کی مورت کو ہر قیمت پہ حاصل کرنا ہے۔جل پری بآواز بلند کہہ گئی تھی کہ اب اگر کسی نے کسی بھی کمزور سمندری مخلوق یا رنگیلی مچھلیوں کو زک پہنچانے کی

کوشش کی یا جل میں رائج کردہ کسی بھی اُصول کو توڑنے کی کوشش کی تو اسے حکم عدولی کی کڑی سزا ملے گی۔ جل پری اعلانیہ یہ سب کہہ کر رنگیلی مچھلیوں کے ہمراہ وہاں سے چلی آئی۔

مہا مچھلی! آپ کے عائد کردہ حکم کے مطابق تمام سمندری باشندے کمزور مخلوق اور رنگیلی مچھلیوں کو حتّی المقدور نقصان پہنچانے سے گریز کرتے ہیں اور شجرلحم ان سب کی بھوک کا خوب سامان ہے، جل پری نے آکٹوپس کو تنبیہ کرنے کے بعد جب بدستور وہی حالات دیکھے تو مسئلہ مہا مچھلی کے سامنے رکھ دیا۔ پھر کیا بات ہے جس نے تمہیں اور رنگیلی مچھلیوں کو پریشان کیا ہوا ہے۔

’’جل پری‘‘ حصّہ (5)

جل پری نے مہا مچھلی کو بتایا...اس آکٹوپس نے تمام جل واسیوں کا جینا اجیرن کر رکھا ہے۔شجر لحم مہیا ہونے کے باوجود وہ ابھی بھی کمزور جل واسیوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور ہر ایک کو نقصان پہنچاتا ہے۔مہا مچھلی حیرت سے سُن رہی تھی۔کیا صرف رنگیلی مچھلیوں کو کھا جاتا ہے۔اس نے پوچھا۔نہیں مہا مچھلی وہ بدنیت اور بدخصلت ہے اس کی ان عادات کی وجہ سے سمندری کیکڑوں نے اسے جل کے اس حصّے سے نکال باہر کیا ہے۔جل پری کی باتوں نے اسے پریشان کر دیا۔وہ فیصلہ کن انداز میں بولی، جل میں رائج کردہ اُصول و ضوابط توڑنے والوں کو معاف نہیں کیا جائے گا۔لہٰذا آج اسے جل کے کنارے مردہ تالاب کے پاس بھوری چٹان میں منتقل ہو جانے کا فیصلہ سناتی ہوں۔

مہا مچھلی کے حکم کے مطابق آکٹوپس کو جل کے باقی حصوں میں داخلے سے منع کر دیا گیا۔جل پری خوشی خوشی رنگیلی مچھلیوں کو بتا رہی تھی کہ اب وہ صرف بھوری چٹان میں ہی

رہے گا۔ پورا جل اس دن بے حد خوش تھا کیوں کہ ایک بہت بڑے عفریت کے ظلم وستم سے ان کی جان آزاد ہوئی تھی۔ جل پری نے رنگیلی مچھلیوں کو کہا، خوش ہو جاؤ تم سب کہ اب تو اس زہریلے آکٹوپس کو سمندری کیکڑوں نے بھی اپنے علاقے سے دربدر کر دیا ہے کیوں کہ وہ چند دن پہلے ہی کسی آدمی کا مردہ جسم نہ جانے کہاں سے اُٹھا لایا تھا۔ ایک رنگیلی مچھلی نے بتایا کہ اس مردود نے کچھ دن قبل ایک نیلے کچھوے کے نئے پیدا ہونے والے بچے بھی دھوکے سے کھا لیے۔ جل پری بولی، مگر وہ نیلے کچھوے کے بچوں کے پاس کیسے پہنچ گیا۔ وہ تو بہت حفاظت سے رکھے ہوتے ہیں۔ رنگیلی مچھلی بولی، اس نامراد نے کچھوؤں کو ڈرایا کہ دو بڑے شارک اور سمندری ڈریگن کچھوے کے گھر پہ حملہ کرنے والے ہیں انھوں نے اسے ہی ان کی حفاظت پہ معمور کر دیا اور موقع ملتے ہی ان کو کھا گیا۔ جل پری اُداس ہوگئی۔ اب مجھے سمجھ آئی کہ کچھ دن پہلے کچھوؤں کی ٹولی بے انتہا اُداس و پریشان تھی۔ وہ پرسوچ انداز سے بولی، پتا نہیں اس کے پاس کون سا ایسا گر ہے کہ سب کو اپنے دام میں کر لیتا ہے۔ رنگیلی مچھلیوں نے کہا، جل پری یہی گر تو اس کا ہتھیار ہے، جن سے وہ اپنے لیے شکار ڈھونڈتا ہے۔

کچھ ہی عرصے میں سب جل پہ اس کی حقیقت کھل گئی تھی اور تمام جل واسیوں کو سختی سے منع کیا گیا تھا کھبھوری چٹان کے قریب سے بھی کوئی نہ گزرے۔ اب وہ آکٹوپس وہیں رہتا اور پھر بھی قریب سے گزرنے والے سمندری جانوروں کو کسی نہ کسی حیلے حربے سے پھانسنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا۔ سب سے بڑھ کر اَب جل پری کے حصول کی خواہش پھانس بن کر اس کے دل میں چبھی ہوئی تھی۔

''جل پری'' حصّہ(6)

اس دن بھی جل پری جل محل میں اپنی ہمجولیوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔مہا مچھلی...مہا مچھلی...! کچھ کیجیے جلدی...سب کی جان کو شدید خطرہ لاحق ہے۔کسی کی چیخ و پکار پہ مہا مچھلی جو کہ جل محل میں ہی موجود تھی۔گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ باہر دیکھا تو سمندری لال بیگ بھاگتے ہوئے جل محل کی طرف آرہے تھے۔ان کا اس طرح بغیر اطلاع و اجازت جل محل میں داخل ہونا یقیناً کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔

کیا ہوا ہے نیلے لال بیگ کیوں بلا اجازت محل میں اس طرح نا وقت تمہارا آنا ہوا؟ مہا مچھلی نے پوچھا۔نیلے لال بیگ سے قبل پہرہ دار کچھوا ہانپتا ہوا اندر آیا مجھے معاف کیجیے گا مہا مچھلی...! میری تھوڑی دیر پہلے ہی آنکھ لگی تھی اور یہ نیلا لال بیگ بغیر مجھ سے اجازت لیے بھاگتا ہوا اندر چلا آیا۔مہا مچھلی نے بغیر کچھ کہے اسے جانے دیا کیوں کہ اسے کسی ناگہانی کا خدشہ ہو رہا تھا۔کہو نیلے لال بیگ...!کس بات نے تمہیں مجبور کیا کہ تم بنا اجازت جل محل میں اس طرح اچانک داخل ہوئے ہو؟ مہا مچھلی کے استفسار پر نیلے لال بیگ کی رکی سانس بحال ہوئی۔مہا مچھلی...!اگلے چند ہی دنوں میں بہت بھیانک سمندری طوفان آنے والا ہے اور

اگر اس سے حفاظت کے لیے مناسب انتظامات نہ کیے گئے تو بہت تباہی مچے گی۔ اوہ! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ مہا مچھلی نے گھبرا کے پوچھا، ہاں مہا مچھلی! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرے باقی ساتھیوں نے بھی اس خطرے کو پوری طرح محسوس کیا ہے اور سب سے بڑھ کے خطرے والی بات یہ ہے کہ اس طوفان میں نیلی ویل، شارک اور آکٹوپس بھی اپنے اپنے علاقوں سے نکل کر اُوپر آجائیں گے۔ ارے نہیں... یہ کیسے ہوسکتا ہے مہا مچھلی نے پریشانی میں گھرے جواب دیا۔ جل کے اُصول کے مطابق وہ جل کے سب سے گہرے حصّے میں اپنے مخصوص علاقے میں ہی رہنے کے پابند ہیں اور اگر وہ اُوپر آجائیں گے تو چھوٹے اور معصوم جل واسی پھر کہاں جائیں گے۔ پھر تو ان سب کی جان کو ہر وقت خطرہ لاحق ہوگا۔ یہی بات تو میں آپ کے گوش گزار کرنے آیا ہوں مہا مچھلی...! نیلا لال بیگ بے تابی سے بولا، نہیں نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ جل میں بھونچال آجائے گا۔ مجھے ضرور کچھ کرنا ہوگا۔ مہا مچھلی نے سوچتے ہوئے کہا کیوں کہ اس کی اطلاع کے مطابق سمندری طوفان آنے میں وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

تمام سمندری جانور اپنے اپنے مخصوص علاقے میں رہ رہے تھے اور کسی کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنے متعین کردہ علاقے سے باہر آکر دوسرے کا سکون برباد کرے۔ خاص طور پہ چھوٹے اور معصوم جانور، جو کہ نسبتاً اُوپری حصّے میں اور الگ تھلگ آباد تھے جہاں تک خطرناک سمندری جانوروں کی رسائی نہیں تھی اور وہ چھپ چھپا کے ہی آتے تھے۔ سمندری طوفان کے آنے کی خبر پورے جل میں پھیل گئی تھی۔ ہر کسی کو اپنی جان بچانے کی فکر لاحق تھی۔ پورے جل میں خوف و ہراس پھیلا تھا۔ ایسے میں مہا مچھلی نے تمام سمندری جانوروں میں سے ایک ایک تجربہ کار جانور کو جل محل بلایا۔

سب سمندری طوفان سے بچنے کے لیے اپنی اپنی تجاویز دینے لگے اور آخر کار سب اسی نتیجے پہ پہنچے کہ طوفان آنے سے قبل چوں کہ سمندری لال بیگ اطلاع کر دیں گے تو ٹھیک اسی سمے

تمام سمندری جانور گہرائیوں میں بنی مضبوط چٹانوں میں پناہ گزیں ہو جائیں گے اور طوفانی لہروں کی موجودگی تک اپنے کھانے پینے کی اشیاء کا بھی وہیں ذخیرہ کر کے رکھیں گے تاکہ اگر زیادہ دیر تک وہاں پناہ لینی پڑے تو خوراک کی کمی نہ ہو۔ مہا مچھلی نے پھر پوچھا، لال بیگو...! ذرا جلدی سے پتا لگاؤ کہ ہمارے پاس کتنا وقت باقی ہے... مہا مچھلی...! میں نے پہلے سے ہی تمام لال بیگوں کو اس کام پہ لگا دیا تھا اور ان کی اطلاعات کے مطابق صرف ایک دن بچا ہے۔ ان کے سردار نیلے لال بیگ نے جواب دیا، اور ہم نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ یہ طوفان تین دن تک رہے گا۔ دو دن شدید اور تیسرے دن اس کی شدت میں کمی آنی شروع ہو جائے گی۔ ایک دوسرے لال بیگ نے لقمہ دیا۔ سب اپنی اپنی تجاویز پیش کر رہے تھے۔ محفل برخاست ہو چکی تھی۔

چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ تمام سمندری مخلوق اپنی اپنی ضروری خوراک وغیرہ کا مناسب ذخیرہ کر کے سمندری چٹانوں کی تہہ میں جا چھپی تھی۔ مہا مچھلی، جل پری اور جل محل میں رہنے والے سمندری جانور جل محل میں ہی پناہ گزیں تھے جو پہلے ہی بہت مضبوط بنا تھا اور ہر لحاظ سے بیرونی خطرات سے محفوظ تھا۔ جس کی رکھوالی دو دیوہیکل شارک کر رہے تھے اور جل میں موجود کسی بھی چھوٹے بڑے کی ہمت نہ تھی کہ وہ بنا اجازت جل محل میں داخل ہو سکے۔ سمندری طوفان و مدو جذر کا مقابلہ ایسے بھی بڑے سمندری جانوروں کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ پورے جل پہ سناٹا طاری تھا اور آخر وہ دن آ ہی گیا جس کے خوف سے سب جل واسی چٹانوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ اس قدر ہولناک بھونچال کہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر اپنی بپھری ہوئی لہروں کو اُٹھا اُٹھا کر ساحل پہ پٹخ رہا تھا۔ چاند اپنے پورے جوبن پہ تھا۔ اس وقت جب جل پہ موت کا سکوت چھایا تھا... کسی بھی جاندار کی نقل و حرکت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایسے میں اگر کوئی ساحل کی طرف جاتا دکھائی دیا تو وہ سمندری کیکڑا تھا۔ جو اچک اچک کر چاند کی طرف لپک رہا تھا۔

سمندری گھوڑا آنکھیں بند کیے اس طوفانی ریلے سے جل کو محفوظ رکھنے کے لیے منتر پڑھ رہا تھا۔ سمندری لال بیگوں سے لے کر بڑے سمندری جانوروں تک سب گہری چٹانوں میں دبکے بیٹھے رہے۔ اُوپر جل محل کے مضبوط پتّھریلے گیٹ حفظ ما تقدم کے طور پہ سختی سے بند کر دیے گئے تھے۔ مہا مچھلی اپنے تخت پہ براجمان باہر کی صورتِ حال پہ نظر رکھے ہوئے تھی۔ جل پری خوفزدہ نظروں سے چاروں اطراف دیکھ رہی تھی۔ مہا مچھلی! کیا یہ طوفانی ریلا سب کچھ تباہ و برباد کر دے گا۔ جل پری کے سوال پہ مہا مچھلی نے کہا، نہیں! سب خیر ہو گی اِن شاء اللہ کیوں کہ طوفان آنے سے قبل ہی ہمیں اس بارے میں آگاہی ہو گئی تھی۔ سب نے اپنے اپنے خاندانوں کو محفوظ مقامات پہ چھپا لیا اور ساتھ ہی کچھ دن کی خوراک بھی جمع کر کے رکھ لی تھی۔ ورنہ اچانک سب طوفانی ریلے کی زد میں آ جاتے اور بہت تباہی مچتی۔ مہا مچھلی نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ جل پری باہر دیکھتے ہوئے بولی، اس کا سہرا سمندری لال بیگوں کے سر جاتا ہے۔ اگر وہ آنے والے طوفان کی خبر نہ دیتے تو پھر سارے جل واسی مصیبت میں پھنس جاتے۔ مہا مچھلی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، واہ آج تو بڑی تعریف ہو رہی اور وہ جو تم ہر وقت ان کی شکایت کرتی رہتی ہو کہ یہ کیوں جل محل میں آ جاتے ہیں۔ مہا مچھلی کے استفسار پہ جل پری شرمندہ ہو گئی۔ وہ لال بیگوں کے اودھم مچانے سے تنگ ہو جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے طوفان تھم چکا تھا۔ ٹھاٹھیں مارتی سمندر کی منہ زور لہریں ایک بہت بڑے بھونچال کے بعد پُرسکون ہو چکی تھیں۔ طوفان کے بعد ایسا سکوت چھایا تھا کہ کسی ذی حس کی موجودگی محسوس نہیں ہو رہی تھی اور پھر زندگی اپنے معمول پہ آ چکی تھی۔

’’جل پری‘‘ (حصّہ 7)

عشق نہ ذات دیکھتا ہے نہ قوم اور نہ ہی مذہب۔ جیب میں پڑے محبت کے سکّے کتنے ہی کھوٹے کیوں نہ ہوں انسان انھیں ہیرے جواہرات کا متبادل سمجھ کر زندگی گزارنے کے خواب ضرور دیکھتا ہے۔ جل پری اور آدم زاد بھی ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے۔ وہ ساحل سمندر پہ دھرے اس بڑے پتّھر کے قریب پورا پورا دن گزار دیتے۔ ایسا ہفتے میں ایک ہی بار ہوتا تھا۔ آدم زاد بھی جل پری کے عشق میں خود کو بُری طرح جکڑا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ان دونوں کے لیے وہ ایک ہی دن پوری زندگی پہ محیط ہوتا تھا جب وہ آپس میں ملتے تھے۔ وہ اسے سمندری دنیا کی کہانیاں سناتی اور اس سے انسانی دنیا کے افسانوی قصّے سُن سُن کر وہاں جانے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ مُلاقات کے بعد وہ جل میں واپس چلی جاتی اور آدم زاد اسے دُور پانی میں اُترتا دیکھ کر خود بھی اپنی دنیا میں واپس آ جاتا۔ اگلا پورا ہفتہ وہ دونوں اس ایک دن کے انتظار میں گزار دیتے تھے۔ سمے گزرنے کے ساتھ ساتھ

ان کی محبت بھی مزید گہری ہوتی جا رہی تھی۔

اس دن بھی آدم زاد اسی پتّھر کے کنارے جل پری کا انتظار کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں آج وہ آنے میں اتنی دیر لگا رہی تھی۔ ابھی وہ بیٹھے بیٹھے مایوس ہی ہونے لگا کہ سامنے پانی کے وسط میں کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی۔ وہ امید بھری نظروں سے اسی سمت دیکھنے لگا۔ وہ جل پری ہی تھی جو خراماں خراماں پانی سے نکلتی آ رہی تھی اور پھر وہ گھوم کر اپنی چمکتی، لچکیلی دم کی مدد سے پتّھر کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔ آدم زاد نے جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر اسے پیار سے تھام لیا۔ اتنی دیر کر دی تم نے آنے میں۔ میں تو اب مایوس ہو چلا تھا۔ آدم زاد نے کہا۔ آج دراصل مہا مچھلی مجھے جل کنارے نہیں آنے دے رہی تھی۔ وہ بولی، جل میں ایک زہریلا آکٹوپس ہے۔ وہ ہر جل واسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تو مہا مچھلی کا حکم تھا، کہ میں آیندہ اکیلی ساحل کی طرف نہ آیا کروں تو تم پھر مجھ سے ملنے نہیں آیا کرو گی... وہ دُکھ سے بولا تھا۔ آؤں گی... ضرور آؤں گی لیکن اب یہ بات مجھے کسی نہ کسی طرح اپنی سکھیوں کو بتانی ہو گی تاکہ مہا مچھلی تک بھی یہ خبر پہنچ جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سب پریشانیاں بھول کر ایک دوسرے سے ساتھ نبھانے کے وعدے کر رہے تھے۔

آدم زاد نے اس سے پوچھا...! کیا تم میرے ساتھ ہمیشہ کے لیے میری دنیا میں چلو گی؟ جل پری حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں کیسے انسانی دنیا میں جا سکتی ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا جل پری... ایک ایک دن میرے لیے ایک صدی کے برابر ہوتا ہے۔ مجھے تمہارے سمندری گیت بلاتے رہتے ہیں۔ میں نہیں جی پاؤں گا۔ تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیے مجھے۔ وہ اپنی بے قراریوں کے قصّے سنا کر رخصت ہو چکا تھا اور وہ اس کے جانے کے بعد ایک نئی سوچ لے کر پانی میں اُتر رہی تھی۔ پانی میں اُترنے سے پہلے اس نے مڑ کر ساحل کی طرف دیکھا۔ آدم زاد بھی مڑ کر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو

الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا دیا۔آدم زاد اس کے جانے تک وہیں کھڑا رہا۔ہلچل کرتا پانی ساکت ہو چکا تھا۔

اس نے سب سے پہلے دوست مچھلیوں کو یہ بات بتائی،انھوں نے بہت حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔جل پری اور ایک آدم زاد سے محبت...!! پھر بات ہوتی ہوئی سمندری کچھوؤں کو پتا چلی وہ سُست رفتاری سے تیرتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور یوں سمندری گھاس پر جا بجا بکھرے سمندری گھونگھوں سے ہوتی ہوئی یہ خبر مہا مچھلی تک جا پہنچی۔وہ کانپ کر رہ گئی۔ایسا کیسے ہوسکتا ہے...؟؟ ایک جل کی رانی اور آدم زاد سے محبت...!!! یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔آدم زاد بے وفا ہے اس کی سرشت میں بے وفائی اور ہرجائی پن ہے۔وہ تو اس آدم زادی سے وفا نہیں کرتا جو اس کے لیے اپنی ساری زندگی تیاگ دیتی ہے تو ایک جل پری سے کیا محبت نبھائے گا۔مہا مچھلی اسے سمجھا رہی تھی۔جل پری تم اس آدم زاد سے دُور رہو۔یوں بھی آدم زاد دنیا کی سب سے خود غرض، مطلبی اور کٹھور مخلوق ہے جس کی بے وفائی کی وجہ سے کئی آدم زادیاں اپنے آپ کو اسی جل کے حوالے کر کے اپنی زندگیوں کا خاتمہ کر چکیں۔سمندری کچھوؤں نے خود مجھے ان کے مردہ جسم دکھائے ہیں اور ایسا ہی ایک آدم زاد تم سے وفا کرے گا...؟ جو اپنی عورت کی وفا کو درخور اعتنا نہیں گردانتا...! ایسی باتیں اسے بتا کر سخت تنبیہ کی گئی کہ وہ آدم زاد سے دُور ہٹ جائے...جل پری بت بنے سب سُن رہی تھی۔مہا مچھلی پھر بولی، مجھے پورا یقین ہے کہ عنقریب ایک ’’جل مانس‘‘ آئے گا جو صرف تمہیں ہی چاہے گا اور وہ تمہاری دنیا سے ہوگا۔جس کے ساتھ تم سارے جل پہ راج کرو گی۔جل پری نظریں جھکائے خاموشی سے ساری گفتگو سُن رہی تھی۔مہا مچھلی نے پاس کھڑے بوڑھے مگرمچھ کی طرف اشارہ کیا۔وہ اس کا اشارہ سمجھ کے بولا، دو مختلف دنیاؤں کے لوگ کبھی بھی یکجا نہیں ہو سکتے جل پری اور اگر ہو بھی جائیں تو جلد یا بدیر جدائی ان کا راستہ روکے کھڑی

ہوتی ہے۔ ایسا قرب عارضی ہوتا ہے اور یہ ملن سوائے دُکھ، تکلیف اور مایوسی کے کچھ دان نہیں کرتا۔ وہ سب جل واسی جل پری کو سمجھا رہے تھے۔

مہا مچھلی برسوں کی تجربہ کار اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئی تھی۔ وہ جل پری کی آنکھوں میں ایک آدم زاد کی محبت کے دیپ جلتے دیکھ چکی تھی۔ جل پری نے جب اقرار کرلیا کہ وہ واقعی اس مدھر بولنے والے آدم زاد کے عشق میں گرفتار ہو چکی ہے تو مہا مچھلی اسے اس قدر تکلیف اور کرب سے دیکھ رہی تھی، جیسے اس نے عشق کے بجائے موت کو گلے لگا لیا ہو مگر اس وقت آنکھوں پہ بندھی عشق کی یہ پٹی اسے اندھا کر چکی تھی۔ آدم زاد کی محبت سب جل واسیوں کی محبت پہ حاوی ہوگئی تھی۔ اس نے کسی بھی قیمت پر آدم زاد کی ہمراہی میں اس کی دنیا میں جانے کا فیصلہ کرلیا خواہ اسے بن باس ہی کیوں نہ کاٹنا پڑے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ عشق کے سورگ واس میں زندگی گذارنے کی خواہش... اسے نرگ میں پہنچا دے گی۔

اس دن وہ سرخ بوڑھے مگر مچھ سے، جو وہاں کا بہت پُر اناراہائشی تھا، پوچھ رہی تھی کہ کیا کبھی کوئی جل پری مکمل انسانی روپ اختیار کر سکتی ہے مگر مچھ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ جل پری اسے خاموش دیکھ کر اصرار کرنے لگی... بتاؤ نا مگر مچھ دادا...!! ایسا کیا کروں کہ میں مکمل انسان بن جاؤں۔ اب چوں کہ رنگیلی مچھلیوں سے ہوتی ہوئی یہ خبر مہا مچھلی تک بھی پہنچ چکی تھی تو وہ باری باری سب سے مدد مانگ رہی تھی کیوں کہ اسے ایک بار مہا مچھلی نے ہی سمجھایا تھا کہ دنیا میں کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہے مگر مچھ کو اس کی بے چارگی پہ ترس آ گیا۔ ہاں ایسا ہونا ممکن ہے... مگر اس کے لیے تمہیں سمندری گھوڑے کے پاس جانا ہوگا۔ سمندری گھوڑے کے پاس... مگر کیوں...؟ جل پری نے سوال کیا اس لیے کہ وہ ہی جادو ٹونہ اور منتر جانتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کے پاس تمہارے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوگا مگر مچھ کی بات سنتے ہی جل پری کی آنکھوں میں اُمید کی بجھتی ہوئی شمع پھر سے روشن ہوگئی۔ وہ

ضرور ملے گی سمندری گھوڑے سے اور آدم زاد کی محبت پانے کے لیے اپنی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ سے پختہ ارادہ کر رہی تھی۔

آج جل پری وقت سے پہلے ہی آ گئی تھی اور آدم زاد کے انتظار میں مخصوص جگہ پہ بیٹھی تھی۔ آج رنگیلی مچھلیاں بھی اس کے ہمراہ ساحل تک آئیں تھیں کیوں کہ جل پری نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اب کی بار جب وہ آدم زاد سے ملنے جائے گی تو وہ بھی ساحل تک ساتھ چلیں گی کیوں کہ ان کو شدید اشتیاق نے آ گھیرا تھا کہ آخر وہ کون ہے جس کے لیے ان کی سکھی تن من دھن قربان کرنے کو تیار ہو گئی ہے۔ ساحل پہ بہت مزے کا کھیل جاری تھا۔ جل پری ایک بڑا غوطہ مار کے ساحل سے اندر کی سمت تیزی سے جاتی اور جب سب رنگیلی مچھلیاں اس کے پیچھے جاتیں تو وہ ایک زوردار جست لگا کر ساحل پہ آ جاتی... رنگیلی مچھلیاں منہ دیکھتی رہ جاتیں... جل پری! یہ غلط ہے، ہم تمہارے پیچھے ساحل تک کیسے آئیں۔ وہ زوردار قہقہہ لگا کے پھر اندر چلی جاتی۔ ان کے کھیل کے دوران ہی کوئی ساحل کی طرف آتا دکھائی دیا۔ رنگیلی مچھلیاں چاپ سُن کر ہی پانی میں چھپ گئیں۔ جل پری پانی سے نکل کر ساحل پہ پڑے اس مخصوص پتّھر کی طرف جا رہی تھی جہاں وہ ملا کرتے تھے۔ اس نے مڑ کے پانی کی طرف دیکھا۔ بظاہر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اسے معلوم تھا، کہ رنگیلی مچھلیاں باہر جھانک رہی ہیں۔ وہ زیرِلب مسکرادی۔

آج تم اتنا دیر سے آئے... میں تو مایوس ہو کے واپس جانے لگی تھی۔ جل پری نے اُداسی سے کہا۔ آدم زاد شرمندہ ہو گیا۔ تمہیں کیا پتا میں تمہاری خاطر کتنا سفر طے کر کے آتا ہوں لیکن یہ میرے دل میں تمہاری محبت ہے مجھے کھینچ کے یہاں لے آتی ہے۔ کاش کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا سکتا۔ وہ افسردہ لہجے میں اسے کہنے لگا۔ جل پری بولی! میں تمہیں بہت جلد ایک خوشخبری سنانے والی ہوں۔ آدم زاد بے تابی سے بولا۔ کیا تم نے سمندری

گھوڑے سے اس بارے میں بات کی۔ جلدی بتاؤ...اس نے کیا کہا۔جل پری ہنسنے لگی۔ کرلوں گی نا بات۔اتنی بے صبری کا ہے کی۔وہ دراصل تین دن سے شارک محل میں موجود ایک بیمار شارک کے لیے تپسیا کر رہا ہے۔اس دوران وہ کسی سے بات نہیں کرتا۔ جیسے ہی اس کا چلہ ختم ہوا۔میں اس سے ملنے جاؤں گی۔ان دونوں نے وہ سارا دن ایک ساتھ گزارا۔ آدم زاد اپنی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی بے تابیوں کے قصّے سناتا رہا۔

''جل پری'' (حصّہ 8)

قربِ محبوب اور تکمیلِ عشق محب کے دل کی وہ خواہش ہوتی ہے جس کے لیے وہ ہر حیلہ حربہ کر گزرتا ہے۔ جادو ٹونے اور تعویذ گنڈے سب سے تھک ہار کر وہ آخر کار سمندری گھوڑے سے اب وہ منتر سیکھ رہی تھی جس سے وہ پوری کی پوری آدم زادی بن سکتی تھی۔ اگر وہ یہ منتر سیکھ لیتی تو ہمیشہ کے لیے ایک مکمل عورت کا روپ اختیار کر لیتی۔ پھر وہ آدم زاد کے سنگ چلی جائے گی۔ آدم زاد اسے اُکسا رہا تھا بار بار اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا۔ اسے ساتھ جانے کو کہہ رہا تھا۔ اس نے جل پری سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زمین کو اس کے لیے جنّت بنا دے گا اور اس دھرتی سے آکاش تک صرف اور صرف محبت کا راج ہو گا۔ وہ اس کی دکھائی ہوئی جنّت اور اس میں پھیلی محبت کے سحر میں سرتاپا جکڑی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کو انسانی دنیا کے قصّے ازبر ہو چکے تھے اور اب وہ ایک ایک منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ سب اسے اس کی محبت سے دستبردار ہونے کو کہہ رہے تھے مگر اسے بیچ سفر کے آدھے راستے

سے واپس پلٹنا اپنی زندگی کھو دینے کے مترادف لگ رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں بند نظارے اور دل میں مقید محبت سے کیسے منہ موڑ لیتی۔ وہ منزل پر پہنچنے سے قبل ہار مان کر واپس نہیں مڑنا چاہتی تھی۔ منتر تقریباً کامیاب ہونے ہی والا تھا اور عنقریب وہ ایک مکمل عورت بن جانی تھی کہ سمندری گھوڑے نے ایک بُری خبر سنا دی۔

وہ سمندری گھوڑے کے روبرو کھڑی تھی۔ جب اسے یہ خبر سننے کو ملی۔ کیا... کیا کہہ رہے ہو...؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ سمندری گھوڑے نے بہت دُکھ سے اس کی طرف دیکھا... ہاں یہ سچ ہے کہ یہ منتر اختتام پہ پہنچتے ہی تم ہمیشہ کے لیے ایک آدم زادی تو بن جاؤ گی مگر اس کے بدلے اپنی قوت گویائی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤ گی۔ اسے یہ خبر سُن کر شدید دھچکا لگا۔ اسے رنگیلی مچھلیوں کے سنگ گائے گئے گیت فنا ہوتے محسوس ہو رہے تھے اور سب سے بڑھ کر اسے اس بات کا شدید قلق تھا کہ اس کے سمندری گیت آدم زاد کو بھی بہت بھاتے تھے مگر اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا اور وہ آدم زاد کو پانے کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھی۔ سمندری گھوڑے نے کہا دیکھو! یہ قربانی تو تمہیں ہر قیمت پہ دینی ہو گی۔ میں نے اپنی پوری کوشش کی لیکن یہ جل تمہاری آواز سلب کر کے ہی تمہیں یہاں سے ہمیشہ کے لیے رخصت کر دے گا۔ جل پری صدمے سے ساکت ہوگئی۔ وہ سامنے کھڑی محبت اور اس کے بدلے میں مانگے جانے والے تاوان کے درمیان اُلجھ کر رہ گئی۔ وہ خود سے سوال کر رہی تھی کیا محبت پانے کے لیے وہ اپنی آواز کا گلا گھونٹ دے۔ کیا انسانی دنیا دیکھنے اور آدم زاد کی محبت میں وہاں رہنے کے لیے وہ اتنی بڑی قربانی دے دے، پھر فیصلہ ہوگیا۔ وہ اپنی آواز جل کو دان کر دے گی۔ وہ ہر قیمت پہ آدم زاد کو حاصل کرے گی اور اس نے سمندری گھوڑے کو اپنا فیصلہ سنا دیا اور پھر وہ ہوگیا کہ جس کے لیے اسے اتنی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ آخر کار وہ سمے بھی آگیا جس دن وہ سارے جل واسیوں کی شدید مخالفت کے باوجود منتر کے ذریعے ایک

مکمل عورت بن گئی... مگر... یہ اس کی بھول تھی ایک مکمل عورت کہاں تھی وہ...؟؟ وہ تو ابھی بھی ایک ادھوری عورت تھی کہ اپنے دلکش سر اور دل کے تار چھیڑتی جلترنگ سی آواز کی لہریں تو سمندر کی تہہ میں ہی دفن کر آئی تھی۔ایک عمر کی تپسیا کے بدلے انعام کی صورت میں اپنے قدموں پہ کھڑی تو ہوگئی مگر جل کے برسوں سے رائج کردہ اُصول توڑنے کے عوض تاوان میں اپنی آواز کا نذرانہ پیش کرنا پڑا سمندری گھوڑے نے ایک گھونگھے کے سیپ میں بند کر کے سمندری گھاس کی آخری تہہ میں دفن کر دی اگر وہ ایسا نہ کرتا تو وہ آواز درد اور کرب کی صورت میں تمام جل میں بین کرتی پھرتی اور جل پری جہاں پہ بھی ہوتی آواز بازگشت بن کر اس کا پیچھا کرتی رہتی۔

پھر سمندری گیت فنا ہو گئے۔بین کرتی آواز سیپ میں بند ہوگئی۔رنگیلی مچھلیاں بھی اس دن اپنے گیت بھول گئیں سارا جل سائیں سائیں کر رہا تھا۔جس دن وہ پہلی بار اپنے پیروں پہ کھڑی ہوئی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔اس وقت وہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش قسمت عورت سمجھ رہی تھی۔وہ دھیرے دھیرے سے قدم اُٹھاتی سمندر سے باہر نکل رہی تھی۔اس کی ٹانگیں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔اسے ابھی چلنا نہیں آیا تھا مگر پھر بھی اس نے اس وادیِ عشق میں قدم رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔جس کے لیے اس نے اپنا جنم سے عطاء کردہ روپ بدلا تھا۔سب جل واسی اس کے انسانی روپ بدلنے سے بہت رنجیدہ تھے اور افسردگی سے اسے اس بدلے ہوئے روپ میں دیکھ رہے تھے اور آخر کار وہ لمحہ آن پہنچا جب وہ اپنی سریلی آواز گنوا کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی تھی۔

ہر محبت تاوان مانگتی ہے۔خراج ادا کرتے رہو تو من و تو کی اُلجھنیں ختم ہو جاتی ہیں عشق انسان کی رُوح میں رچ بس جاتا ہے۔منازل عشق طے کرتے کرتے روم روم سے محبوب کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ابتدائے عشق سے لے کر انتہائے عشق تک وجود عشق لاحاصل

رہتا ہے کیوں کہ لوگ جسے باہر ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں اس کا ٹھکانہ تو اندر ہوتا ہے اور جب اندر خالی ہو جائے تو وجود میں بس دھڑکن ہی رہ جاتی ہے۔ ایسی دھڑکن تو بس خود کو بھی سنائی نہیں دیتی۔ ایسا ہی عشق جل پری کے دل میں بس چکا تھا کہ جس کو پانے کے لیے وہ اپنا رنگ روپ، آواز اپنی سکھیاں، سمندری ساتھی اور سب سے بڑھ کر مہا مچھلی کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ایک اجنبی آدم زاد کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ وہ اس عشق کے حصول کے لیے بہت بھاری تاوان ادا کر چکی تھی اور آگے پتا نہیں کتنا خراج ادا کرتے رہنا تھا لیکن وہ اپنا سب کچھ گنوا کر آدم زاد کے ساتھ انسانی دنیا میں جانے کے لیے تیار تھی۔

''جل پری'' (حصّہ 9)

وہ جل چھوڑ کے جا رہی تھی۔ وہ اپنی دانست میں ایک مکمل عورت بن چکی تھی۔ رنگیلی مچھلیاں، سمندری کچھوے اور سمندری گھاس تک اس کے پیروں سے لپٹ رہے تھے۔ وہ اسے اپنا فیصلہ تبدیل کر کے، واپس آنے کے لیے کہہ رہے تھے مگر وہ جب ایک مرتبہ کچھ ٹھان لیتی تھی تو کر کے ہی دم لیتی تھی۔ سب نہ چاہتے ہوئے بھی ساحل پہ اسے الوداع کہنے آئے تھے۔

اسے جل چھوڑنے کا بے حد دُکھ تھا۔ جس دن وہ جل چھوڑ کے آدم زاد کے ساتھ جا رہی تھی، جل واسیوں کے لیے اُداس تو بہت تھی مگر آدم زاد کی ہمراہی میں چلنا، اس کی محبت پانا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن چکی تھی۔ سب اسے اپنے قدموں پہ چلتا اور رخصت ہوتا دیکھ رہے تھے۔ وہ مڑ کر انھیں آخری بار خدا حافظ کہنا چاہتی تھی مگر اس کی آواز کے ست رنگے سر بکھر گئے، لبوں پہ ہر دم رہنے والے گیت فنا ہو چکے تھے۔ اس نے

ان سب پر الوداعی نظر ڈال کر بس ہاتھ ہلا دیا۔سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔مہا مچھلی نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔وہ اس سے ناراض ہو چکی تھی۔

اس کی انکھوں میں جمے کرب واذیت کے آنسووہ دیکھ چکی تھی ایک نامراد اور ناکام جذبے کے پیچھے اپنی زندگی کا سودا کرنے والے ایسے ہی گھاٹے میں رہتے ہیں اور مہا مچھلی نے اسے خدا حافظ بھی اسی لیے نہیں کہا کہ برسوں کا تجربہ اسے چیخ چیخ کر آگاہ کر رہا تھا کہ اسے نامراد ہی لوٹنا ہے وہ یہیں کی ہے اور یہیں واپس آئے گی مگر تب...سب ویسا نہیں ہوگا جیسا وہ چھوڑ کے جا رہی ہے اور اگر سب کچھ ویسا ہوا بھی...تو وہ خود ویسی نہیں رہے گی۔رنگیلی مچھلیوں نے ساحل کے قریب اس کے سامنے ڈیرہ ڈالا تھا۔ایک نے سوال کیا۔کیا تم واقعی ہمیں،مہا مچھلی اور تمام جل واسیوں کو چھوڑ کے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤ گی؟ جل پری حیرت سے ان سب جل واسیوں کو دیکھنے لگی،وہ سب جو اس سے محبت کرتے تھے۔جنہوں نے اس کو خوش رکھنے کے لیے تمام حیلے بہانے کر ڈالے مگر آدم زاد کو پانے کی آرزو میں وہ سب کی محبتوں کو قربان کرنے پہ تیار ہوگئی۔اس نے انتہائی افسردگی اور بے چارگی سے جل واسیوں کی جانب دیکھا،رنگیلی مچھلیاں غم و یاس کی تصویر بنے اس کے اردگرد گھومتی رہیں۔نیلے کچھوؤں کی ٹولی بین کرنے لگی۔یہاں تک کہ سمندری گھاس اس کے پاؤں سے لپٹ گئی اور اسے یوں محسوس ہوا کہ زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لیے ہیں۔اس کے چلنے کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔بالآخر اس کے پختہ ارادے کے سامنے سب جل واسی ہار گئے اور سمندری گھاس نے بھی اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔پھر وہ سب کو غمزدہ کر کے آدم زاد کے سنگ اس کی دنیا میں چلی آئی۔

''جل پری'' (حصّہ 10)

ضرار اسے کسی صورت بھی اپنے گھر نہیں لے کر جانا چاہتا تھا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ اس کی سوتیلی ماں اور بھائی کبھی بھی اسے وہاں رہنے کی اجازت نہیں دیں گے اور پھر پچھلی مرتبہ گھر گیا تو سب کے عجیب سے بدلے ہوئے رویے دیکھ کر اُلجھن میں مبتلا ہو گیا تھا جو اسے کسی انہونی کا پتا دے رہے تھے۔ اس لیے وہ بغیر وقت ضائع کیے جل پری کو اپنے گھر کے بجائے کسی دوسرے شہر میں الگ تھلگ سے بنے ایک گھر میں لے آیا۔ وہ اسے باقی معاملات سمجھانے کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت دینا نہ بھولا کہ وہ اپنے ماضی کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گی کیوں کہ اسے ڈر تھا کہ کہیں لوگ اسے انجانی دنیا کی مخلوق سمجھ کر تماشا نہ بنا لیں۔ وہ اسے سمجھانے کے بعد خود ہی ہنس دیا۔ وہ حیران ہو کے اسے دیکھنے لگی۔ ارے پگلی! تم کون سا بول سکتی ہو کہ کسی کو کچھ بتاؤ گی۔ وہ شدید دُکھ سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ اس نے اس کے ماتھے پہ پیوست پر چھپانے کے لیے ایک خوب صورت سی کیپ لادی تھی جو اسے

اب شاید ساری عمر پہننی تھی۔اس کے پر اس کیپ میں چھپ جاتے تھے۔اچھا تو ایسا کرتے ہیں کہ سب سے پہلے تمہارا ایک نام رکھتے ہیں۔اس کے بعد آج شام میں ہی ہم دونوں کا نکاح ہوگا۔وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔وہ اس کا نام سوچنے لگا۔اس نے بہت سوچنے کے بعد اسے ”بنت البحر“ کا نام دیا تھا۔دیکھو! آج کے بعد تمہارا نام بنت البحر ہے اور سب تمہیں اسی نام سے پکاریں گے اور تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ میں آدم زاد ضرور ہوں لیکن میرا نام ضرار بن ہشام ہے۔اس نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔کاش کہ وہ اسے اس کے نام سے پکار سکتی مگر یہ خواہش ہمیشہ حسرت ہی رہنی تھی۔پھر اس نے اسے گھر چھوڑنے کے بعد مارکیٹ کا رُخ کیا تا کہ اس کے لیے کچھ کپڑے اور گھر کا ضروری سامان خرید سکے۔

جب گھر واپس آیا تو وہ اسی طرح ایک جگہ بیٹھی تھی۔اسے غصہ آ گیا۔!ارے تم اسی طرح ایک جگہ بیٹھی ہو۔اب یہ تمہارا گھر ہے کچھ عرصہ تمہیں یہیں رہنا ہے پھر تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔وہ یکدم گھبرا گئی۔اسے اس پہ ترس آ گیا۔اسے احساس ہوا کہ یہ سب اس کے لیے بالکل نیا ہے۔وہ رفتہ رفتہ سب سمجھ جائے گی۔اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے دھیرے دھیرے سمجھانے لگا۔تمھیں پریشان ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں۔بہت جلد ہر چیز سے آگاہ ہو جاؤ گی۔شام میں کچھ قریبی دوستوں کو ہی دعوت دی تھی۔وہ اس کے لیے ہلکے گلابی رنگ کی بے حد خوب صورت میکسی لایا تھا۔ساتھ سلور کلر کی کیپ لباس کا حصّہ معلوم ہوتی تھی کیوں کہ اس کے ساتھ ہی خوب صورت جالی کا دوپٹہ اٹیچ تھا۔اسے اس کے دوست کی بیوی نے تیار کیا تھا اور جل پری نے تیاری کے دوران کمال ہوشیاری سے اپنے پر چھپا لیے تھے۔اسی روز شام کو اس کے دو قریبی دوستوں اور ان کی فیملیز کی موجودگی میں چھوٹی سی تقریب میں ان دونوں کا نکاح ہو گیا۔سب اس کی بیوی کی خوب صورتی کی تعریف کر رہے تھے اور ساتھ ہی اس کی بے زبانی پہ دُکھ کا اظہار بھی۔ایک دوست کی بیوی نے تو ازراہ ہمدردی پوچھ لیا...ضرار بھائی!

کیا بھابی پیدائشی طور پہ ہی بول نہیں سکتی تھیں یا کسی حادثے میں یہ قوت گویائی سے محروم ہوگئیں۔ وہ ضرار کی طرف دیکھنے لگی۔ضرار نے بات سنبھالی۔ارے نہیں بھابی! پیدائشی ہی ان کے ساتھ یہ مسئلہ تھا۔دوسرے دوست کی بیوی بولی! لیکن ضرار بھائی کی پسند کی داد دینی ہوگی۔اس قدر خوب صورت ہیں یہ کہ لگتا ہی نہیں اس دنیا کی ہیں۔اب کے وہ بُری طرح گھبرا گئی۔واقعی یہ تو آسمان سے اتری کوئی حور یا پری لگ رہی ہیں۔ان کی تعریف وتوصیف نے ضرار کا سیروں خون بڑھا دیا اور اس طرح دو الگ الگ دنیاوں سے تعلق رکھنے والے دو افراد اس دن ایک ہو گئے۔اب وہ باقاعدہ طور پہ ضرار کی بیوی بن چکی تھی۔وہ بنت البحر تھی مگر اَب اسے انسانوں کی دنیا میں ایک انسان کے ساتھ رہنا تھا جس کی خاطر وہ اپنا سب کچھ داؤ پہ لگا آئی تھی۔

گھر بہت بڑا تھا اور سارا خالی تھا۔ایک دو کمروں میں ہی ضرورت کی کچھ اشیا پڑی تھیں۔وہ دو ہی دن اس کے ساتھ رہنے کے بعد اسے تنہا چھوڑ کے کہیں چلا گیا کیوں کہ اسے اپنا پراجیکٹ ختم کر کے واپس جانا تھا اور ارادہ یہی تھا کہ پہلے اکیلا گھر جائے گا اور پھر اپنی شادی سے متعلق کچھ بتائے گا۔گھر سے نکلا تو یہی سوچ کر تھا کہ شام تک واپس آجائے گا مگر واپسی ممکن نہ ہوسکی۔جل پری کے بارے میں سوچ کے پریشانی ضرور ہوئی کہ اسے ابھی اکیلے چھوڑ کے نہیں آنا چاہیے تھا لیکن مجبوری ایسی آن پڑی کہ دو دن رہنا پڑ گیا۔

اس کے جانے کے بعد بنت البحر پہلے تو اس کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ پھر جب بھوک نے ستایا... چاروں اطراف نظر دوڑائی تو کچن میں کھانے پینے کا کچھ سامان مل گیا۔ اس کے سامنے ضرار نے ایک دو مرتبہ کھانا بنایا تھا مگر وہ چیزوں کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔ اسے کچھ پسند نہ آیا۔وہ بددلی سے اپنے بنائے کھانے کو دیکھ رہی تھی۔بس دل پہ جبر کر کے زہر مار کیا اسے سمندری کھانا اور شجر لحم یاد آرہے تھے۔وہ پہلی ہی سیڑھی پہ ڈگمگا گئی تھی جب اسے

ایک اور مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ دن ڈھل چکا تھا اور شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ پورے گھر کو اندھیرے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ شدید وحشت کا شکار ہوگئی۔ ایک تو گھٹا ٹوپ اندھیرا اس پہ تنہائی، اس نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند کرلیا۔ شکر ہے کہ اس نے دن میں کچھ نہ کچھ کھا لیا تھا ورنہ اور بھی مصیبت ہوتی۔ اسے رنگیلی مچھلیاں اور دوست کچھوے یاد آنے لگے وہ اندھیرے میں انھیں پکار رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہہ نکلی۔ رات کاٹنی ایک عذاب تھی۔ وہ اپنے سمندری دوستوں کو پکارتے پکارتے پتا نہیں کب سوگئی۔ خواب میں وہ جل محل میں موجود اپنے بستر پہ محو دراز تھی اور رنگیلی مچھلیاں اسے گیت سنا رہی تھیں۔ سمندری لوری نے جلد ہی اسے نیند کی وادی میں پہنچا دیا۔ آخر کار صُبح ہو ہی گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو یکدم اُٹھ کے اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے آپ کو ایک بار پھر اجنبی دیس میں پایا۔ دل دُکھ سے بھر گیا۔ بے اختیار دل میں دبی خواہش اُبھری کہ کاش یہ حسین خواب کبھی نہ ٹوٹتا۔ وہ اپنا محاسبہ کرنے لگی کہ شاید وہ اپنے فیصلے پہ پچھتا رہی ہے لیکن وہ اپنے آپ سے بھی یہ اقرار نہ کرسکی کہ واپسی کے راستے تو مسدود ہو چکے تھے اور کشتیاں جل چکی تھیں۔

اگلے دن بھی اس نے دن میں ہی سب کام نبٹا کر سرِ شام اپنے آپ کو کمرے میں بند کر دیا۔ تیسرے دن وہ شام کو گھر پہنچا اور ارد گرد پھیلے اندھیرے دیکھ کر خوب شرمندہ ہوا۔ ارد گرد روشنی کی تو وہ ایک کمرے میں بند ملی۔ ضرار کو دیکھتے ہی اس کا ضبط ٹوٹ گیا۔ وہ رو رہی تھی اس نے بڑی مشکل سے اسے چپ کروایا۔ وہ اسے سمندری مخلوق سمجھ کر بزدلی کا طعنہ دے رہا تھا۔ وہ اس سے ناراض ہوگئی تھی۔ سب سے پہلے اسے روشنی لگانے کا طریقہ سمجھایا جو نئی عمارت ہونے کی وجہ سے ابھی پوری طرح سیٹنگ میں نہیں آئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ اسے منانے میں کامیاب ہوگیا اور وہ اسے اپنے بنائے عجیب وغریب کھانے دکھانے لگی۔ وہ دل کھول کے ہنسا۔ وہ رات شاید اس کی زندگی کی حسین ترین راتوں میں سے ایک تھی جب باہر

دالان میں پڑے جھولے پہ بیٹھے وہ آسمان پہ پھیلے تاروں کو دیکھتے رہے لیکن اب وہ اس کے سمندری گیتوں کو بے طرح یاد کر رہا تھا۔ وہ بھی اس کی بات سُن کر ایک ایسے کرب سے گزر رہی تھی جو دل میں درد بن کے گڑ گیا۔ سینے میں اٹکے گیت دل میں دفن ہو چکے تھے۔ وہ رات جس کا آغاز خوشی سے ہوا تھا سپیدہ سحر نمودار ہونے تک دُکھ درد کی سوغات بھی اس میں شامل ہو گئی تھی۔ ضرار بھی اُٹھ کے کمرے میں جا چکا تھا۔ اس کے دل میں پہلی بار احساس جاگا کہ کیا وہ ساری عمر ایک ایسی آدھی ادھوری عورت کے ساتھ گزارے گا جو گونگی خاموشی سے اس کا استقبال کیا کرے گی۔ اس کے کان ساری عمر سندر آواز کی مدھرتا کو ترسیں گے۔ وہ خود سے یہ اقرار نہ کر پایا کہ اسے اپنے فیصلے پر پچھتاوہ ہو رہا ہے کیوں کہ اسے اندازہ تھا کہ اپنے فیصلے پر پچھتانے والے زیادہ دیر اس فیصلے پر ٹک نہیں پاتے۔

پھر اس کا معمول بن گیا۔ وہ ایک دو دن ادھر رہ کر پھر کہیں غائب ہو جاتا اور کئی کئی دن اس کا کچھ پتا نہ ہوتا۔ وہ جو انسانی دنیا میں انسانوں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی اسے شدید بے چینی اور مایوسی نے آ گھیرا تھا۔ اب وہ کبھی کبھار اسے گھر سے باہر بھی لے جاتا اور لوگوں سے میل جول بھی بڑھا تو اس نے انسانی دنیا کے باشندوں کے چہرے، رویے اور مزاج بھی سمجھنے شروع کیے۔ وہ گھر سے باہر جانے سے قبل سر پہ آدم زاد کی لائی ہوئی خوب صورت سی ٹوپی پہن لیتی تا کہ ماتھے میں پیوست پیدائشی مور پنکھ دیکھ کر کوئی سوال نہ کر سکے۔ اب اسے اکیلے گھر میں رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا تھا۔ وہ جل پری سے بنت البحر بن چکی تھی مگر ہر رات سپنوں میں جل محل اسے بلاتا تھا۔

”جل پری“ (حصّہ 11)

بنت البحراب رفتہ رفتہ انسانی دنیا کی عادی ہونے لگی تھی۔اس دوران ضرار کا اپنے گھر آنا جانا لگا رہا۔ہشام صاحب کا خیال تھا کہ اب اسے پراجیکٹ ختم ہونے کے بعد واپس گھر آجانا چاہیے۔وہ کمپنی جس کے ساتھ ان کا ایگریمنٹ ہوا تھا۔اس کے کام سے بہت خوش تھی اور ان کے تعریفی جملے اس کے باپ کا سیروں خون بڑھا گئے۔وہ بیٹا جس کی تعلیم و تربیت اور پرورش بیوی کی وفات کے بعد ان کے لیے ایک امتحان بن گئی تھی۔اس سے چھوٹے دونوں بیٹے مکمل توجہ اور اعلیٰ اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اس اہل نہ بن سکے کہ ان کے پھیلے ہوئے کاروبار میں ہاتھ بٹا سکیں۔وہ بیٹا جسے کل وہ دوسری شادی کے بعد ایک بوجھ سمجھنے لگ گئے تھے۔آج ان کا دایاں بازو بن کے کھڑا تھا۔

آج وہ کافی عرصے بعد گھر آرہا تھا۔سوتیلی ماں دُردانہ بیگم، جس کا سلوک شروع میں ناقابل برداشت تھا اب اس کو بھی سمجھ پڑ گئی تھی کہ اپنے دونوں بیٹے تو بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے

کسی قابل نہ بن سکے اور اسے ہر وقت کا خدشہ کہ سوتیلا بیٹا جس نے باپ کی تمام ذمہ داریاں اگر پوری نہیں تو آدھی سے زیادہ بانٹ لیں تھیں۔ دل میں ایک خوف بیٹھ گیا کہ کہیں ساری جائیداد اور مال و دولت ضرار کے ہاتھ ہی نہ آجائے۔ لالچ و ہوس نے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ یکا یک ہی کرلیا۔ وہ اپنی بھانجی الوینہ کو کال ملا رہی تھی۔

فون الوینہ نے ہی اُٹھایا۔ ہیلو آنٹی! کیا ماما سے بات کرنی ہے اس نے مصروفیت کے عالم میں جلدی سے آواز لگائی۔ ارے رکو تو، جلدی کس بات کی ہے تمہیں۔ میں نے تم سے ہی بات کرنی ہے اور وہ بیس منٹ تک ہاں، ہوں، ایسے نہیں، ٹھیک ہے کہہ کر سر ہلاتی رہی۔ اوکے آنٹی شام تک میں پہنچ جاتی ہوں اور ساتھ ہی ماما اور حارث کو بتا بھی دیتی ہوں کہ اب میں ایک ماہ ادھر ہی گزاروں گی۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی تھی۔ دُردانہ بیگم اپنے پھینکے ہوئے پتے سے ساری بازی جیتنے کی تیاری کرنے لگی اور اسے معلوم تھا کہ آگے اسے کیا کرنا ہے۔

ہشام صاحب اپنا پراجیکٹ کامیابی سے مکمل ہونے کی خوشی میں جو تقریب منعقد کرنا چاہ رہے تھے اس کا چیف گیسٹ کوئی اور نہیں بلکہ ان کا بیٹا ضرار بن ہشام تھا اور اس وقت ان کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب دُردانہ بیگم نے اپنی بھانجی الوینہ کے رشتے کی بات کی۔ پہلے تو ہشام صاحب نے عینک کے اُوپر سے حیران ہو کر دُردانہ بیگم کو دیکھا۔ کیا تم اپنے ضرار کی بات کر رہی ہو، انھیں جیسے اپنے کانوں پہ یقین نہ آیا۔ بچپن سے ہی اس کو گھر سے دُور رکھنے، ہاسٹل میں ڈلوانے پر مجبور کرنے والی آج ان کے آگے اسی کے لیے اپنی فارن پلٹ بھانجی کا رشتہ پیش کر رہی تھی لیکن پھر پرسوچ انداز میں انھوں نے بیوی کی طرف دیکھا۔ بات تو پتے کی تھی، کیوں کہ دوسرے دونوں بیٹے ناکارہ نکلے، ماں کے بے جا لاڈ پیار اور غلط تربیت کی وجہ سے سوائے ان کی جمع پونجی کو اُڑانے کے کوئی کام نہ تھا۔ اس پہ اگر کوئی باہر کی

لڑکی آجائے، یا ضرار اپنی مرضی سے کوئی لے آئے تو وہ یقیناً اسے ان سے الگ کرنے کی کوشش کرے گی اور اگر وہ اسے جائیداد وغیرہ سے عاق بھی کر دیتے تو بڑھاپے میں ان کے بزنس اور مالی معاملات کو کون سنبھالے گا۔ وہ سوچتے سوچتے... بہت دُور کی کوڑی لائے تھے۔ واقعی اس سے بہتر حل نہیں تھا اس مسئلے کا۔ وہ جھٹ سے تیار ہو گئے اور پھر جلدی جلدی اِدھر اُدھر فون کر کے مختلف ہدایات جاری کرنے لگے۔ دُردانہ بیگم بھی بھاگ دوڑ میں مصروف تھیں۔ گھر کی جلدی جلدی صفائی ستھرائی اور آرائش وزیبائش بھی کی جانے لگی کیوں کہ شام کو کامیابی کے جشن کے علاوہ ضرار کی منگنی کی تقریب بھی تھی۔

پورے گھر کو بہت خوب صورت انداز سے سجایا گیا تھا۔ برقی قمقمے اور رنگ برنگی روشنیوں نے عجیب سا سماں پیدا کر دیا تھا۔ مہمانوں کی بھی آمد ورفت وقفے وقفے سے جاری تھی۔ ضرار بھی آن پہنچا تھا لیکن ابھی اس کو سرپرائز دینے کے چکر میں سب چھپایا گیا۔ وہ گھر کی آرائش وزیبائش دیکھ کے پہلے تو حیران ہوا... مزید ششدر اس وقت ہوا، جب اپنی سوتیلی ماں کا بدلا ہوا رویہ دیکھا۔ لہجے میں گھلی چاشنی، پیار محبت سے واری جاتی، بلائیں لیتی اور بار بار اس کی ایک ایک بات کا خیال رکھتی اسے عجیب سا کھل رہی تھی لیکن وہ حسب عادت خاموش رہا البتہ اس کے اپنے لاڈلے نے محسوس کر کے فوراً ٹوکا! ہائے ممی... طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔ اس کی جانب دیکھ کر وہ دونوں بھائی زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ ضرار کو عجیب سی سبکی محسوس ہوئی اور دُردانہ بیگم چور سی بن گئیں۔ باپ کی آمد نے قصّہ سنبھال لیا۔ ایک طرف کو سٹیج بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا جس پہ دو شاہانہ صوفے رکھے تھے۔ اسے عام سے گھریلو، سادہ لباس میں دیکھ کر ہشام صاحب نے فوراً ٹوکا، یہ کیا...؟ تم نے کپڑے نہیں بدلے ابھی تک۔ جاؤ جا کے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ وہ اُٹھ کے کمرے میں جانے لگا تو پیچھے سے آواز لگائی، تمہارے لیے نیا سوٹ بنوا کے رکھا ہے۔ وہی پہن کے آنا۔ اس نے چپ چاپ سر ہلا

دیا۔بچپن کی محرومیوں نے اسے نہ کہنا سکھایا ہی نہیں تھا۔

خوب صورت سیاہ تھری پیس سوٹ دیکھ کر وہ پہلے چونکا تو ضرور، مگر باپ کا کہا من وعن تسلیم کرنے کی عادت نے کبھی کسی بات پر اعتراض یا انکار کرنا تو درکنار ان کے سامنے سر ہی اُٹھانے نہ دیا۔ وہ اس سے قبل ایسے کبھی تیار نہ ہوا تھا۔تیاری کے بعد قد آدم آئینے میں اپنا آپ دیکھ کر عجیب سا محسوس ہوا۔وہ زیادہ تر خود سے بے پرواہ ہی رہتا تھا لیکن آج اس کی تیاری دیکھ کے پہلے دُردانہ بیگم، اس کے سوتیلے بھائی اور پھر ہشام صاحب حیران ہوئے تھے۔اچانک ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔وہ انجانے میں اپنے اس بیٹے کے ساتھ بہت بُرا سلوک کر گئے تھے۔اپنے سے دُور رکھا اور کام ہی لیتے رہے لیکن اب انھوں نے سوچ لیا تھا کہ اس کے سب دُکھوں کا ازالہ کریں گے۔

ہال میں اتنی زیادہ رش نہیں تھی۔چیدہ چیدہ مہمان بلائے گئے تھے۔الوینہ کا اس سے آمنا سامنا ہو چکا تھا اور وہ وقفے وقفے سے اسی کے ارد گرد گھوم رہی تھی۔کھانے پینے کی انواع واقسام اشیاء ساتھ ساتھ ہی پیش کی جا رہی تھیں۔پس منظر میں چلتی موسیقی کی آواز ماحول کو مزید خوب صورت بنا رہی تھی۔اچانک اسے سٹیج پہ بلوایا گیا۔وہ سمجھا کہ شاید فوٹو سیشن کے لیے بلا رہے ہیں۔اس کے سٹیج پر پہنچتے ہی ہشام صاحب نے مائک تھام لیا۔آج میں اپنے بیٹے ضرار کے ساتھ بھانجی الوینہ رضا کے نکاح کا اعلان کرتا ہوں۔امید ہے کہ جلد ہی یہ شادی کے مقدس بندھن میں بھی بندھ جائیں گے۔وہ اچانک پڑنے والی اس اُفتاد سے اس وقت سنبھلا، جب نکاح خواں اس سے پوچھ کے دونوں کو رشتہ ازدواج میں باندھ چکا تھا۔وہ ساری رسومات کے دوران بت بنا باپ کے ہر حکم پہ سر جھکاتا رہا۔پھر وہ لمحہ بھی آیا جب اس کے مضبوط ہاتھ میں الوینہ کا ہاتھ دے دیا گیا اسے دُور کہیں جل پری کھڑی دکھائی دی۔اس نے گھبرا کے الوینہ کا ہاتھ جھٹک دیا۔کسی اور کی نظر نہ پڑی ہو مگر الوینہ کو نہایت سبکی محسوس ہوئی۔

اسے اس رشتے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن آنٹی نے جب اسے مستقبل کے سبز باغ دکھائے تو وہ فوراً تیار ہوگئی لیکن اسے ضرار کا یہ ہتک آمیز رویہ ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ ہشام صاحب نے تحکمانہ انداز میں ڈائمنڈ کی انگوٹھی ضرار کے ہاتھ میں دی اس نے کسی معمول کی طرح فرمانبرداری سے الوینہ کی اُنگلی میں پہنا دی۔ ہال تالیوں کی آواز سے گونج اُٹھا۔وہ گھبرا کر اسٹیج سے اُتر آیا۔رات گئے تک محفل چلتی رہی۔سب کے بہت مجبور کرنے پہ بھی وہ دوبارہ ہال میں نہ گیا اور دیگر مہمانوں کے ساتھ ہی رہا۔ہشام صاحب اس کے رویے کو نارمل لے رہے تھے۔اچانک ہو جانے والے فیصلے کے ردِّعمل کے طور پر اگر وہ ایسا رویہ دکھا رہا تھا تو انھیں اُمید تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اسے سمجھا دیں گے کہ اس کے مستقبل کے لیے کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔وہ پارٹی ختم ہونے کے بعد دُردانہ بیگم کے شکوہ کرنے پر،اس سے زیادہ اپنے آپ کو تسلی دے رہے تھے۔

''جل پری'' (حصّہ 12)

انسانی دنیا میں قدم رکھتے ہی بنت البحر کو اندازہ ہو گیا کہ یہ سمندری دنیا سے بے حد مختلف ہے اور سب سے عجیب بات یہ تھی کہ سمندر میں انواع و اقسام سمندری مخلوق تھی کسی کے دو پر، تو کسی کے چار، کسی کے پانچ ہاتھ اور کوئی صرف ایک آنکھ والا لیکن اس کے باوجود بھی سب بے حد اتفاق اور محبت سے رہتے تھے۔ جل کے کچھ اُصول اور ضابطے تھے جن کی پابندی ہر چھوٹے بڑے کو کرنی پڑتی تھی اور حکم عدولی یا زیادتی کرنے والے کو جل بدر کر دیا جاتا تھا مگر انسانی دنیا کے باشندے بہت عجیب تھے۔ ایک طرح کے قد و قامت، ڈیل ڈول اور وضع قطع ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے برسرِ پیکار، جھوٹے، دغاباز اور کینہ پرور ہر وقت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور ایک دوسرے پہ سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف اور روپے پیسے کی ریل پیل ہونے کے باوجود لالچ، ہوس، خود غرضی اور انتہا درجے کی مطلب پرستی تھی اور اسے اندازہ ہو گیا کہ نہ صرف انسانی دنیا بلکہ آدم زاد بھی ویسا ہی

تھا... پہلے پہلے وہ اسے اپنا وہم سمجھتی رہی مگر جلد ہی اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ انسان ہے ہی ابن الوقت، اپنا مطلب نکلتے ہی دوسرے انسان کو کسی فالتو اور بے کار چیز کی طرح پھینک دینے میں ایک پل بھی نہیں لگاتا۔ وقت بہت آگے سرک آیا تھا۔ ضرار کی سنگت میں پیار بھری زندگی گذارنے کی جو خواہش لے کر وہ اپنا سب کچھ تاوان کر آئی تھی وہ بہت جلد ایک پچھتاوہ بن گیا اور یہ پچھتاوہ ہر آنے والے دن ایک نئی کسک بن کر اس کے دل کو سلگاتا تھا۔

یہ نہیں تھا کہ اس کے دل میں ضرار کی محبت کم ہوگئی تھی لیکن یہ ضرور سچ تھا کہ ضرار کے دل میں اس کی محبت کے رنگ پھیکے پڑ چکے تھے۔ اپنے پیار کو پانے کی پاداش میں وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ زیادہ دیر یہاں ٹک نہیں پائے گی۔ اسے انسانی دنیا میں چلنا نہیں آسکا تھا۔ وہ یہاں کے جھوٹ، دھوکے اور فریب سے مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ وہ چلتے چلتے تھک گئی تھی۔ اگر ہمراہ چلتا شخص اس کی قربانیوں کو سمجھتا تو وہ بہت خوشی سے رہ لیتی مگر اس کی سُست چال اور زباں پہ لگے قفل سے وہ اُکتا گیا تھا۔ کبھی وہ اس کے میٹھے سروں کا دیوانہ ہوا کرتا تھا مگر اَب تو وہ یہ سر بھی کھو چکی تھی۔ وہ جہاں کہیں پانی دیکھتی پانی کی لہریں اسے اپنی طرف کھینچتیں اور اسے لگتا کہ جل واسی اسے واپس بلا رہے ہیں پھر وہ کئی کئی دن بے چین رہتی اور اسے دن بدن محسوس ہونے لگ گیا تھا کہ ضرار اس سے اُکتانے لگ گیا ہے اس کی جیب میں پڑے محبت کے سب سکے واقعی کھوٹے نکلے۔ ایسا لگتا تھا کہ ضرار کا دل اس سے اوب گیا ہے، اب اکثر جب وہ آتا، تو اس کے ساتھ کوئی اور آدم زادی بھی ہوتی... اسے انسانی دنیا کے کھانے بنانے بھی آ گئے تھے۔ شروع کے کچھ دنوں میں اسے آدم زاد نے سکھائے تھے۔ وہ خاموشی کے ساتھ کھانا بنا کر انھیں دے آتی کہ زبان بندی تو شاید قدرت نے یہاں آنے سے پہلے اسے عنایت کر دی تھی... اسے پتا نہیں تھا کہ وہ

اس کی کون تھی اور یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس عورت کو آدم زاد نے اس کے بارے میں کیا بتایا تھا لیکن اس پہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ اس کا وجود اپنی تمام تر خاموشی اور بے نیازی کے باوجود اس عورت کی آنکھوں میں بُری طرح کھٹکتا تھا۔ وہ جب کھانا بنا کر انھیں دینے جاتی تو ناگواری کی ایک سرد لہر اس عورت کے چہرے پر دوڑ جاتی۔ پتا نہیں وہ عورت اس کے اور آدم زاد کے درمیان اب آ گئی تھی یا پہلے سے اس کی زندگی میں کہیں موجود تھی لیکن یہ ضرور تھا کہ اب اس کی حیثیت گھر میں پڑے فالتو کاٹھ کباڑ سے بھی بدتر تھی۔

نکاح والے دن ہی الوینہ نے ٹھان لیا تھا کہ خواہ کچھ بھی کرنا پڑے اسے ہر قیمت پہ ضرار کا دل جیتنا ہے۔ نکاح والے دن تو ضرار دو دن گھر رکنے کے بعد کسی ایمرجنسی کا کہہ کے گھر سے چلا گیا لیکن ہشام صاحب نے اس پہ پابندی لگا دی کہ جلد از جلد پراجیکٹ ختم کر کے یہیں شفٹ ہو جائے۔ اس دوران اسے مکمل چھوٹ دینے کے بجائے یہاں کے آفس کا بھی بے تحاشا کام سونپ دیا۔ جس کی وجہ سے وہ بمشکل پراجیکٹ کے کام نبٹا کے فوراً یہاں آجاتا۔ اس طرح الوینہ کو اس کے قریب آنے اور توجہ حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔

آفس کے کام سے پانچ دن کے لیے سکردو کا ٹرپ تھا جس میں دو بڑی غیر ملکی کمپنیاں بھی شامل تھیں۔ ہر کمپنی اپنے ساتھ دو مرد اور ایک خاتون ممبر بطور نمائندہ لے کے جانے کی پابند تھی۔ ضرار نے پہلے سوچا کہ بنت البحر کو ساتھ لے کر جائے لیکن والد نے الوینہ کو ساتھ لے جانے کو کہا کیوں کہ وہ بھی آفس کے کاموں میں کافی مدد کرتی تھی۔ ضرار نے بہت سوچا... الوینہ اور بنت البحر... نہیں نہیں... بنت البحر کسی صورت بھی اس کے ساتھ کسی سرکاری میٹنگ یا بزنس فنکشنز میں جانے کے قابل نہیں۔ پہلے تو اسے اتنے بڑے اور پڑھے لکھے لوگوں میں طریقے سے چلنا ہی نہیں آئے گا۔ ایسے ہی لوگوں کو دیکھ کے گھبراتی رہے گی۔ دوسرا یہاں آ کے کچھ نہ کچھ بولنا پڑے گا۔ مختلف موضوعات پہ لوگوں سے بات چیت کرنی ہو گی لیکن وہ تو

بولنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی تھی۔تیسری مصیبت اس کے ماتھے پہ پیوست پر تھے۔جن کو مختلف کیپس کے نیچے چھپاتے چھپاتے وہ تھک چکا تھا اوراسے ہر لمحے یہ راز فاش ہوجانے کادھڑ کالگا رہتا تھا۔

انہی باتوں کوسوچتے سوچتے ،قرعہ فال الوینہ کے نام نکلا۔اس دن الوینہ کی خوشی دیدنی تھی جب اسے پتا چلا کہ وہ ضرار کے ساتھ سکردو جارہی ہے۔وہ کافی عرصے سے اس کا جھکاؤ اپنی طرف ہوتے دیکھ چکی تھی اورآنٹی دُردانہ کو اپنی کامیابی کے قصّے سنا رہی تھی۔اسے کچھ عرصہ قبل بنت البحر کے بارے میں بھی پتا چل گیا تھا۔جب اس نے ضرار کے موبائل میں اس کی تصویریں دیکھیں تھیں لیکن دُردانہ آنٹی کے سمجھانے پہ چپ کی چادر اوڑھ لی تھی اورایک دن موقع پا کے ضرار سے دوستانہ انداز میں سب کچھ اگلوالیا۔ضرار نے سوائے اس کے جل پری ہونے کے باقی سب گوش گزار کردیا کہ وہ اسے ایک حادثے میں ملی اور مجبوراًاس سے نکاح کرنا پڑا کیوں کہ اس کے والدین مرچکے ہیں۔آنٹی دُردانہ اورالوینہ نے اسے باپ کو کچھ بھی بتانے سے منع کر دیا اور اس کے اس کمزور پہلو سے خوب فائدہ اُٹھایا۔اب تو الوینہ ضرار کے ساتھ اس کے اس گھر میں بھی جاتی تھی ،جہاں بنت البحر رہتی تھی۔الوینہ جب بھی وہاں جاتی۔بنت البحرا پنے کمرے سے باہر نہ آتی اوراس وقت نکلتی ،جب کھانے کاوقت ہوتا۔وہ کھانا بنا کے جس خاموشی سے آتی ،ویسے ہی واپس چلی جاتی۔

ضرار نے اگرچہ کے اسے بتادیا تھا کہ وہ پیدائشی طور پہ گونگی ہےلیکن اس کی آنکھیں بولتی تھیں۔کالی گہری آنکھیں۔اسے ان سے عجیب سا خوف محسوس ہوتا۔اسے دیکھتے ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔پھرایک دن وہ بھی آیاجب آنٹی دُردانہ نے اسے کہا کہ وہ بنت البحر کو طلاق دے دے۔ورنہ وہ الوینہ کو چھوڑ دے۔وہ اضطراری کیفیت سے انھیں دیکھنے لگا۔! آنٹی... یہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔میں بنت البحر کو چھوڑ دوں تو وہ کہاں جائے

گی۔اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور سب سے بڑی بات کہ وہ میری خاطر...اس نے کچھ کہتے کہتے زبان دانتوں میں داب لی۔ٹھیک ہے کہ وہ بنت البحر سے پوری طرح اُکتا گیا تھا۔اس کی محبت دل کے کسی کونے میں پُرانے بے کار سامان کی طرح رکھ چھوڑی تھی بلکہ کسی وقت تو وہ اسے اپنی زندگی پر بوجھ ہی لگتی تھی۔اس کے باوجود اس نے کسی لمحے بھی اسے چھوڑ دینے یا اس سے چھٹکارا پانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور آج اس کی ہونے والی بیوی اور سوتیلی ماں اسے ایک نئی راہ دکھا رہی تھی کہ اگر وہ بنت البحر کو چھوڑ بھی دیتا ہے تو اسے اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ الوینہ کا بھائی ہیپی بنت البحر پہ بُری طرح فدا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔ یہ سُن کر اس کا خون بُری طرح کھول اُٹھا۔آنٹی نے اسے دو دن کا وقت دیا تھا۔

الوینہ کا بھائی ہیپی ماڈلنگ کرتا تھا اور اوباش قسم کا لڑکا تھا۔اسی نے ضرار کے فون میں ایک بار بنت البحر کی مختلف تصاویر دیکھی تھیں اور بعض تصویریں اس وقت کی بھی تھیں جب وہ جل پری تھی۔وہ اس کا حسن و جمال اور سمندری روپ دیکھ کر حیران رہ گیا۔مختلف تصاویر کے ساتھ ساتھ کہیں جل پری اور کہیں بنت البحر کا کیپشن دیا گیا تھا۔وہ اسے فوٹو شاپ اور ایڈیٹنگ کا کمال سمجھا۔جب اسے الوینہ سے پتا چلا کہ وہ تو ضرار کی بیوی ہے تو شاکڈ رہ گیا اور اسی کے بنائے گئے پلان کے تحت آنٹی دُردانہ اور الوینہ ضرار کے سامنے دھمکی کارڈ استعمال کر رہی تھیں۔اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جاتے۔نہ صرف بنت البحر سے نجات پانے کے بعد ضرار اور اس کی ساری دولت کی اکیلی مالک بن جاتیں بلکہ ضرار ساری عمران کے سامنے راز فاش ہونے کے ڈر سے دبا رہتا۔اس کے علاوہ ہیپی کی تو لاٹری لگ جاتی۔وہ کب سے اپنی ماڈلنگ کمپنی کے لیے کوئی نیا اور یونیک چہرہ ڈھونڈ رہا تھا جو اسے جلد ہی ملنے والا تھا۔

گھپ اندھیرے میں جلتے بجھتے لائٹر کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی سرگرم عمل تھا۔

آج وہ بہت دن بعد بنت البحر کے ساتھ اس کے گھر پہ تھا۔آنے والے کچھ ہی روز میں اس کی اور الوینہ کی شادی طے تھی اور اس دوران ہی یہ ساری حقیقت سوائے اس کے باپ کے سب کے سامنے آگئی۔وہ بیچ منجدھار کے پھنسا تھا۔کوئی سمت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔اگر بنت البحر کا ساتھ ہی اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو ایک ہی پَل میں آسمان سے زمین پر آجائے گا۔اس کے پَل پَل کی محنت اور ساری عمر کی تگ و دو کے نتیجے میں پھل کھانے کا وقت آیا تو سب مال و دولت اور جائیداد دوسرے ہتھیا لیں گے اور اس کے پاس رہ جائے گی ایک گونگی، جاہل اَن پڑھ لڑکی جسے وہ ناحق سمندر کی تہہ سے اُٹھا لایا تھا جو اب اس کے گلے پڑی ایسی مصیبت کی طرح تھی جسے وہ ہر قیمت اتار پھینکنا چاہتا تھا۔

''جل پری'' (حصّہ 13)

بنت البحر اور اس کا چند دن قبل شدید جھگڑا ہوا تھا۔ وہ اسے پیپی کے ساتھ جانے کے لیے کہہ رہا تھا تاکہ وہ اسے ایک کمرشل میں بطور ماڈل سامنے لانے کے لیے ٹریننگ دے سکے کیوں کہ اس شعبے میں حسن و خوب صورتی ہی کافی نہیں تھی اسے ابھی بہت زیادہ گرومنگ کی ضرورت تھی۔ پیپی نے اس کے سامنے ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس کی گندی نظریں بنت البحر کے جسم سے آر پار ہو رہی تھیں۔ اس نے بُری طرح اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پیپی اپنی بے عزتی پہ سخت تاؤ میں آگیا اور دل میں ٹھان لی کہ ہر قیمت پہ اسے حاصل کرنا ہے۔

کچھ دن قبل آنٹی دُردانہ نے ضرار سے کہا تھا کہ وہ اسے گھر لے کے آیا کرے تاکہ وہ ان لوگوں میں ایڈجسٹ ہو سکے اور اٹھنا بیٹھنا سیکھ سکے۔ پہلے تو الوینہ نے بہت برا منایا۔ آنٹی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں وہ گنوار عورت مجھ سے وہاں برداشت نہیں ہوتی تو آپ اسے یہاں بلا رہی ہیں تاکہ وہ ضرار کے ساتھ ساتھ رہے اور میرا دل جلاتی رہے۔ ارے لڑکی! پاگل مت بنو میں اسے یہاں ضرار کی وجہ سے نہیں بلکہ پیپی کی وجہ سے بلوا رہی ہوں تاکہ وہ اسے اپنی طرف مائل کر سکے۔ الوینہ بات سمجھ کے چپ ہو رہی۔ آنٹی دُردانہ کے اصرار پر وہ اس مرتبہ

آتے ہوئے، بنت البحر کو ساتھ لے کر آیا تھا کیوں کہ ہشام صاحب دو ہفتے کے لیے ملک سے باہر گئے تھے۔ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ دیکھو! تمھیں اپنے گھر اس لیے لے کر جا رہا ہوں تا کہ تم ان لوگوں میں رہنا سیکھ لو اور یہی تو تم چاہتی تھی نا... انسانی دنیا میں... انسانوں کے ساتھ رہنا۔ اب جب تمھیں موقع مل رہا ہے تو تم ناخوش ہو۔ اس نے انکار میں گردن ہلائی اور اس کے ہاتھ تھام کے اپنے ہاتھ پہ رکھ دیے جس کا مطلب تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ وہ بات سمجھ کے انجان بن گیا۔

ضروری سامان کے ساتھ وہ لوگ گھر پہنچ چکے تھے۔ الوینہ گھر پہ نہیں تھی۔ ضرار کے پوچھنے پہ پتا چلا کہ وہ بیوٹی پارلر گئی ہے صبح سے۔ دُردانہ بیگم حیران تھیں کہ وہ ایک ان پڑھ، گنوار، گونگی لڑکی سے کیوں اتنی پریشان ہے مگر جیسے ہی ان کی نگاہ اس کی طرف اُٹھی... تو دیکھتی ہی رہ گئیں۔ اس قدر حسن شاید ہی کہیں دیکھا ہو۔ سر پہ مضبوطی سے جمی شاندار سی کیپ... اس کی ذات کا حصّہ ہی معلوم ہوتی۔ واقعی یہ تو اس زمین کی لگتی ہی نہیں۔ کوئی اپسرا... پری... یا کوئی حور... جو راستہ بھٹک کے دنیا میں آ نکلی ہو۔ کون ایسا ہوگا جو اس کے طلسم سے بچ سکے۔ انھیں اس کے ملکوتی حسن سے شدید خوف محسوس ہوا۔ الوینہ سچ ہی کہتی تھی کہ یہ لڑکی ان کے مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے اس لڑکی سے جان چھڑانی چاہیے۔ انھوں نے خود کلامی کی۔

اسے ملازمہ کے حوالے کیا کہ اس کے کمرے میں چھوڑ آئے۔ پُرسوچ انداز میں بیٹھی تھیں کہ پپی آتا دکھائی دیا۔ کیوں ڈیئر آنٹ! مبہوت ہو گئیں نا اس کا حسن و جمال دیکھ کے۔ انھوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب دیکھتی جائیں کہ پپی کے ہاتھ یہ ہیرا لگتے ہی اسے ٹاپ کلاس ماڈل بنا دوں گا۔ واقعی بات تو دل کو لگتی ہے۔ پتا نہیں کمبخت کہاں سے لائی ہے اتنا حسن۔ نہ دیکھا... نہ سنا۔ انھوں نے کہا۔ ڈونٹ وری آنٹ، جتنی جلدی ہو سکے اس کو موم کرنے

کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ کوئی اور لے اُڑے۔ ویسے بھی ضرار کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پتا نہیں کیا سوچ کے شادی کر لی تھی۔ دولت کی چکا چوند کے آگے حسن کی دولت بھی کھوٹے سکے کی طرح ہوتی ہے۔ اب کے دُردانہ آنٹی نے نخوت سے کہا تھا۔

بنت البحرا اپنے کمرے میں تھی۔ ضرار اسے چھوڑ کے کہیں چلا گیا تھا۔ دُردانہ بیگم بھی الوینہ کا انتظار کرتے کرتے تھک کے اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ اسی موقع کے انتظار میں ہیپی تاک لگائے بیٹھا تھا۔ دُردانہ آنٹی کا ایک بیٹا سنی بھی اتفاق سے گھر پہ ہی تھا۔ ہیپی سب کے کمرے کا جائزہ لے کر اس کمرے کے سامنے کھڑا اندر جانے کو پر تول رہا تھا جہاں جل پری موجود تھی۔ ہلکے سے ہاتھ سے دروازہ اندر دھکیلا۔ وہ بے آواز کھلتا گیا۔ وہ سامنے پڑے بیڈ پہ نیم دراز تھی۔ ہلکی سی آہٹ محسوس ہونے پہ چونک کے دروازے کی سمت دیکھا۔ ہیپی دروازے کے بیچوں بیچ ایستادہ تھا۔ یکدم اس کے کسی ردعمل سے بچنے کے لیے پیچھے مڑ کے دروازے کو کنڈی لگا دی۔ وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وہ ایک جست میں اس تک پہنچ گیا تھا اس کے ناپاک ہاتھ اس کے جسم کو چھو رہے تھے۔ اس میں پتا نہیں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی اسے پوری قوت سے دھکا دے کر وہ باہر کی طرف بھاگنے لگی تو اس کی کیپ اُتر گئی۔ ہیپی اس کے ماتھے پہ اگے مور پنکھ دیکھ چکا تھا۔ اس نے جلدی سے کیپ پہنی اور کنڈی کھول کر باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ زور زور سے دروازے کھلنے، بند کرنے کی آواز سُن کے دُردانہ بیگم باہر آ چکی تھیں۔ اتنے میں ہیپی ہانپتا ہوا بکھرے بالوں کے ساتھ بنت البحر کے کمرے سے برآمد ہوا۔ یہ ادھر کیا چل رہا تھا۔ وہ صفائی دینے والے انداز میں ہیپی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ جب کہ ہیپی بولا، آنٹی! یہ تو یونہی گھبرا گئی تھی۔ میں اسے سکھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے کیسے ایک ایک اسٹیپ لے کے چلنا ہے اور کس طرح بیٹھنا ہے۔ یہ واقعی بہت جاہل اور گنوار ہے۔ لے کے دھکا مارا مجھے زور کا۔ اگر خود کو نہ سنبھالا

ہوتا تو ابھی سر پھٹ جاتا۔ اتنے میں گاڑی کا ہارن ہوا تھا۔ پھر بڑے سے لاؤنج میں سے ضرار اور الوینہ قدم بہ قدم چلتے دکھائی دیے ہاتھوں میں بڑے بڑے شاپنگ بیگز اور دیگر سامان اُٹھائے۔ وہ ضرار کی کسی بات پہ قہقہہ لگاتے اندر داخل ہوئی تھی۔

بنت البحر اسی لمحے چکرا کے گری تھی۔ ضرار تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ دُردانہ بیگم اور الوینہ نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہوش میں آئی تو خود کو اپنے ہی گھر کے بستر پہ پایا۔ اردگرد پھیلی تنہائی دیکھ کے اندازہ ہو گیا کہ ضرار اسے چھوڑ کے چلا گیا ہے۔ دُردانہ بیگم کسی بھی طرح بپی والا واقعہ ضرار کے گوش گزار نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے بہتر یہی سمجھا کہ ضرار کو سمجھا بجھا کے اسے واپس اس کے گھر بھجوا دیں۔ ضرار ان کی زبانی یہ سُن کے کہ وہ یہاں شاید ایڈجسٹ نہیں ہو پا رہی اور کسی چیز کو دیکھ کے ڈر گئی ہے۔ اسے واپس گھر لے آیا تھا۔ اس کی طبیعت رات تک بہت خراب رہی۔ رات میں وہ واپس گھر آ گیا تھا۔ وہ اسی طرح بے سدھ پڑی رہی۔ وہ اسے اس طرح لیٹے دیکھ کے حیران ضرور ہوا۔ کیا ہوا ہے تمہیں۔ کب سے ایسے پڑی ہو اور تمہیں پتا ہے تمہاری وجہ سے مجھے کتنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ کتنی سبکی محسوس ہوئی جب مجھے دُردانہ آنٹی نے بتایا کہ بپی تمہیں ماڈلنگ کے انداز سکھانے کی کوشش کر رہا تھا اور تم نے اس پہ حملہ کر دیا۔ سوچو اگر اسے کچھ ہو جاتا تو کون ذمہ دار ہوتا۔ تم گنوار کی گنوار ہی رہو گی ہمیشہ... میں تمہارا کیا کروں اب۔ نہ تم کچھ سیکھنا چاہتی ہو، نہ آگے بڑھ سکتی ہو۔ وہ اس کی طبیعت بھول کر شدید غصّے کی حالت میں باہر نکل گیا۔ وہ صدمے سے رونے لگی۔ اسے بہت عرصے سے اس کے بدلے تیور دکھائی دے رہے تھے۔ اسے الوینہ اور دُردانہ بیگم کی آنکھوں سے جھانکتی نفرت اور ناپسندیدگی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ انسانوں میں رہ کر ان کے گھٹیا چال چلن سے پوری طرح واقف ہو گئی تھی۔ اس کے شوہر کا جان بوجھ کے اسے بپی کی طرف مائل کرنا، دُردانہ بیگم کے دونوں بیٹوں کے

چہروں سے جھانکتی خباثت اور سب سے بڑھ کر ضرار کی بے اعتنائی... ہر ایک تکلیف اس کے لیے اب برداشت سے باہر تھی۔ ایسے میں امید کی کونپل اس وقت پھوٹی۔ جب اس کی طبیعت خراب ہونے پہ اچانک اسے اُٹھا کے ہسپتال لے جانا پڑا اور آنکھ کھلنے پہ خوشخبری اس کی منتظر تھی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ یہ اس کی خام خیالی ہی تھی کہ ضرار یہ خبر سُن کر خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔ کیا خبر تھی کہ یہ اطلاع اس کے لیے موت کی پیامبر ثابت ہو گی۔

وہ گزشتہ تین گھنٹے سے کمرے میں بند سگریٹ پہ سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ بنت البحر کو ساتھ لے کے چلے مگر وہ ہر قدم پہ اس کے لیے ایک مسئلہ ہی تھی۔ سوچا تھا کہ ہپی اگر اسے اپنا لیتا تو وہ بآسانی اسے چھوڑ کے الوینہ کے ساتھ زندگی گزارتا جو ہر طرح سے اس کے ساتھ چلنے کے قابل تھی لیکن وہ اس کے سارے پلان کا ستیاناس کر آئی بلکہ اب ہپی نے اس کے مور پنکھ بھی دیکھ لیے تھے جن کے بارے میں وہ بدستور سوال کر رہا تھا اور اَب تو یہ نیا مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔ جب اسے اس کی پریگنینسی کا پتا چلا تھا۔ اس کا دماغ بہت سی باتیں مختلف زاویوں سے سوچ رہا تھا۔ اگر بنت البحر نے انسان کے بجائے کسی جل پری کو جنم دے دیا تو ساری دنیا کے سامنے اس کے خاندان کا تماشہ بن جائے گا اور پھر وہ اس کو دنیا سے چھپاتا پھرے گا یا سمندر میں بہا دے گا۔ وہ اس وقت خود غرضی کی انتہا پہ پہنچ گیا تھا۔ اسے اس مسئلے کا ایک ہی حل سجھائی دیا اور اسے جلد از جلد اسے انجام دینا تھا۔ کہیں سوچتے سوچتے وقت ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ پھر فیصلہ ہو گیا تھا۔ اس کا دل دماغ ایک نکتے پہ مرکوز ہو چکے تھے۔ اس نے ٹھان لیا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

''جل پری'' (حصّہ 14)

وہ ان دنوں بہت خوش تھی۔ضرار کی بے اعتنائی بھی اسے زیادہ تکلیف نہیں دے رہی تھی کیوں کہ اب اس کی آنکھوں میں نئے خواب سجے تھے۔اسے وہ دن یاد آیا جب ان کے جل میں موجود شارک نے بچے دیے تھے۔ وہ کس قدر خوش ہوئی تھی۔سارا سارا دن شارک کے بچوں سے کھیلتی رہتی اور آج وہ خود ماں بننے جارہی تھی۔اس کے چہرے پہ عجب سا نور کا ہالہ ہمہ وقت احاطہ کیے رہتا تھا۔

اسے اپنے سمندری دوست بے طرح یاد آرہے تھے۔اگرانھیں اس بارے میں پتا چلتا تو وہ سب کتنا خوش ہوتے اور رنگیلی مچھلیاں تو رقص کر کر کے تھک جاتیں۔کاش کہ وہ ایک بار پھر ان سب سے مل سکے اور اس سمے اسے نہیں معلوم تھا کہ فرشتے اس کی دعا پہ آمین کہہ چکے ہیں۔

رات وہ گھر پہ نہیں تھا۔وہ منہ اندھیرے ہی اُٹھ گئی تھی کہ کسی نے دروازے پہ دستک

دی۔مخصوص سی آواز ضرار کی ہی تھی۔وہ بہت جلدی میں گھر آیا تھا۔جل پری! جلدی سے تیار ہو جاؤ... ہمیں کہیں جانا ہے۔ضرار گھر میں داخل ہوتے ہی اسے آوازیں دینے لگا۔وہ اس کے جل پری کہہ کے پکارنے پہ حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی کیوں کہ جب سے اس کا نام بنت البحر رکھا گیا تھا۔اس کا اصل نام لینا تو وہ بھول ہی گیا تھا۔وہ اشارے سے پوچھنے لگی کہ! کہاں جانا ہے؟ سوال مت کرو اور جلدی تیار ہو جاؤ۔اس کے سخت لہجے نے اسے پریشان کر دیا۔صُبح سویرے پتا نہیں وہ اسے لے کر کہاں جا رہا تھا۔وہ گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگا کے گہری نیند سو گئی۔اس کی آنکھ کھلی تو گاڑی ایک جگہ رکی تھی۔شاید دن گزرے بھی کافی وقت ہو گیا تھا۔وہ کتنا سوئی تھی۔ضرار کھانے کے لیے کچھ لے آیا۔پھر سڑک کے ذریعے ہی سفر کرتے پورے دو دن بیت گئے تھے۔ایک دن تو وہ درمیان میں کسی ہوٹل میں رُکے تھے۔اسی طرح چلتے رکتے نہ جانے انہوں نے کتنے ہی شہر پار کر گئے تھے۔اسے سفر نے شدید تھکا دیا تھا۔آخر میں اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ اسے بہت اُداس اور پریشان لگا تھا۔بہت چپ چپ سا اور بکھرا ہوا، جیسے کسی اضطراری کیفیت سے گزر رہا ہو۔وہ اس کی طرف بنظر غور دیکھنے لگی۔اس کی محویت محسوس کر کے وہ گھبرا گیا۔ جیسے کوئی چوری کرتے پکڑا گیا ہو۔

وہ آج پھر ایک ہوٹل پہ رات رکے تھے۔ اگلے دن دوبارہ کسی انجان رستے پہ سفر شروع ہو چکا تھا اور شام کے قریب آخر کار وہ اپنی منزل مقصود پہ پہنچ گئے۔شہر میں داخل ہونے کے بعد مختلف گنجان آباد راستوں سے ہوتی ہوئی گاڑی ایک جانی پہچانی سی جگہ پر جا کر رُک گئی کیوں کہ آگے کا رستہ پیدل چلنا تھا۔وہ اِدھر اُدھر حیران سی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور ان رستوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔پھر وہ تیز قدموں سے سامنے کی طرف چلنے لگی۔وہ اس جگہ کو پہچان گئی تھی۔گو کہ ابھی وہ لوگ ساحل سمندر سے بہت دُور تھے لیکن وہ اپنی

مٹّی، اپنی شناخت کہاں بھولی تھی۔ بہت زیادہ چلنے کے بعد اسے ساحل سمندر نظر آ گیا۔اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کے وہاں پہنچ جائے۔ضرار بھی اس کے ساتھ ساتھ تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔آخر کار وہ دونوں اس پتّھر کے قریب پہنچ گئے جہاں وہ پہلی بار ملے تھے۔وہ سمندر کو دیکھ کر بے اختیار کسی ماہی بے آب کی طرح مچل رہی تھی۔ سمندر کے پانی میں طوفان برپا ہو گیا۔اسے پانی کی لہریں اپنی طرف بلا رہی تھیں۔جل پری کو دیکھ کر لہروں نے بھی اپنا سر ساحل پہ پٹخنا شروع کر دیا۔وہ اشارے سے ضرار کا شکریہ ادا کر رہی کہ وہ اسے سمندر سے ملوانے کے لیے لایا ہے۔اسے ضرار کی ساری بے اعتنائیاں اس وقت بھول چکی تھیں۔وہ اسے پتّھر پہ اپنے ساتھ بیٹھنے کا کہہ رہی تھی مگر وہ کٹھور پن سے کنارے لگ کے کھڑا رہا۔اسے ضرار کا رویہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔اسے کسی انہونی کا احساس ہو رہا تھا۔اس کے دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔آخر کار ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی لہروں کے شور میں ضرار کی آواز اُبھری۔

”میں تمہیں ہمیشہ کے لیے یہاں چھوڑنے آیا ہوں جل پری اب میں مزید تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔تم میرے ساتھ قدم ملا کے نہیں چل سکتی۔دو مختلف دنیاؤں کے لوگ کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔اس کی چلتی ہوئی سانسیں گویا تھم سی گئیں۔سارا جسم کان بن گیا۔ کسی وقت یہ آواز اس کے لیے زندگی کا پیغام تھی اور آج یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے پگھلا ہوا سیسہ کسی نے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔وہ بولے جا رہا تھا۔جیسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے مجرم کو سزائے موت سنا دی جاتی ہے۔اس نے ایک ہاتھ سے دھڑکتے دل کو تھامنے کی بے سود کوشش کی۔جس کی دھک دھک سمندر کے پانی کی جاندار آواز میں مدغم ہو رہی تھی۔ یکا یک وہ اس بڑے پتّھر پہ بے دم سی ہو کر گر گئی۔اسے لگ رہا تھا کہ وہ ساری عمر اس پتّھر سے نہیں اُٹھ سکے گی۔وہ جو سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی لہروں کو دیکھ کر بے چینی سے ان کی طرف

بھاگ رہی تھی۔اب دکھ وتکلیف کی شدت سے حرکت کرنے کے بھی قابل نہ تھی۔اسے لگتا تھا کہ جیسے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ دیا ہو،کسی اور نے نہیں بلکہ اس کے اپنے آدم زاد نے...نہیں...نہیں...آدم زاد اس کے ساتھ ہرگز ایسا نہیں کرسکتا۔وہ اس کی محبت،اس کی قربانیوں کو کیسے فراموش کرسکتا ہے۔وہ اپنے آپ کو طفل تسلیوں سے بہلارہی تھی مگر یہی سچ تھا کہ وہ اسے ہمیشہ کے لیے واپس چھوڑنے آیا تھا اور آخرکار،بلاتقصیر اسے اسی پتّھر کے کنارے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا۔وہ اس کے پیچھے بھاگ کر پہنچنا چاہتی تھی مگر اس کے قدموں نے جواب دے دیا۔ایسا لگ رہا تھا کہ زمین نے اس کے قدم جکڑ لیے ہیں۔وہ اپنی پوری قوت لگانے کے باوجود ایک قدم بھی نہ چل سکی۔وہ زور زور سے اسے پکارنا چاہ رہی تھی مگر آواز کے سرتو پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے وہ اس سے اپنا گناہ پوچھنا چاہ رہی تھی۔وہ اَب اپنے قدموں پہ مزید کھڑی نہ ہوسکی۔اگلے ہی لمحے صدمے سے نڈھال بے ہوش ہوکر جل کنارے گر چکی تھی۔

اسے سب سے پہلے ان سمندری سبز کچھوؤں کی ٹولی نے دیکھا،جو ساحل کی گیلی ریت پہ دُھوپ کے مزے لوٹ رہے تھے۔وہ اسے پہچان چکے تھے۔وہ حتّی المقدور تیزی سے اس کی طرف بھاگے۔ان میں سے دو اس کے قریب آ کر اسے ہلانے لگے اور باقی واپس سمندر کی طرف پلٹے تاکہ مہا مچھلی اور باقی سب کو اس کی واپسی کی اطلاع دے سکیں۔سب سے پہلے وہاں پہنچنے والا رنگیلی مچھلیوں کا ٹولہ تھا۔وہ اپنی دموں میں پانی بھر بھر کے اس کے منہ پہ ڈال رہی تھیں۔اندر کہیں دُور...جل میں مہا مچھلی کو لہروں نے کسی کی آمد کا سندیس دیا۔وہ تیزی کے ساتھ ساحل کی طرف آرہی تھی۔سمندری گھاس نے بھی مانوس سی خوشبو پا کر خوشی سے جھومنا شروع کر دیا تھا۔سمندری گھوڑے نے اپنے منتر روک دیے۔رنگیلی مچھلیوں اور سمندری گھونگھوں کو بھی ہوا کے جھونکوں نے کچھ بتانے کی کوشش کی۔سارے جل

میں ہلچل مچ چکی تھی۔سمندر کی لہروں نے ہوا کے جلترنگ کے ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا۔ آج جل کی رانی واپس آ گئی تھی۔متروک شدہ گیت ساحلی ہوا میں ایک بار پھر سے گھل مل گئے تھے۔کہیں دُور جاتے بادل جل کی رانی کو دیکھ کے سمندر پہ سایہ فگن ہو گئے تھے۔سب ہی جل واسی جل سے جھانک رہے تھے۔وہ ہوش میں آ چکی تھی اور اس کی نظر سب سے پہلے جس پہ پڑی وہ مہا مچھلی تھی۔

''جل پری'' (حصّہ 15)

وہ پوری طرح ہوش میں آچکی تھی۔سب اس کی طرف ترحم بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔اس کی قوت گویائی تو پہلے ہی سلب ہو چکی تھی لیکن اس کی حالت زار دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اگر وہ بول بھی سکتی تو اب اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ویسے بھی اس کی زرد رنگت... پاؤں کے آبلے...اور بکھرے دُھول مٹّی سے اٹے بال اس کی داستان سنا رہے تھے۔

وہ مجرم بنی سب کے سامنے تھی۔سب اس کی زبانی اس کی کہانی سننا چاہ رہے تھے مگر کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اس سے کوئی کچھ پوچھتا اور وہ سناتی بھی کیسے جلا وطنی اور بے زبانی تو اسے آدم زاد کے ساتھ عشق کے ناکردہ گناہ میں تحفے کے طور پر سونپ دی گئی تھی۔اس کی حالت اس وقت تختہ دار پہ کھڑے اس شخص جیسی تھی جس کے پھانسی پہ لٹکانے یا تختہ دار سے اتارنے کی بات ہو رہی ہو۔وہ سب کی سوالیہ نظروں کی وجہ سے شدید گھبراہٹ

کے عالم میں لڑکھڑا کر مہا مچھلی کے آگے اس طرح گر پڑی کہ آدھی پانی کے اندر اور آدھی باہر تھی۔شکر صد شکر...کہ پانی نے اسے دھتکارا نہیں تھا،سمندر کی لہروں نے بے تابی سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا،اس کا چہرہ اُوپری دھڑ کے ساتھ پانی کے اندر تھا اور آدھا حصّہ پانی سے باہر سب دم سادھے اسے دیکھ رہے تھے اور سانس روکے کھڑے تھے کہ پتا نہیں اب پانی میں وہ سانس لے بھی پائے گی یا نہیں مگر یہ دیکھ کر سب نے سکون کا سانس لیا کہ وہ پانی میں ابھی بھی سانس لے سکتی تھی وہ جل کو دھتکار کے چلی گئی تھی مگر جل نے اسے گلے لگا لیا۔وہ جل پری سے بنت البحر بن کے انسانی دنیا میں چلی گئی تھی مگر جب انسانی دنیا نے بنت البحر کو دھتکار دیا تو جل نے ایک بار پھر سے اسے گلے لگا لیا۔

وہ سمندر کی بیٹی تھی اور اسے سمندر کی لہروں نے ہی ایک بار پھر سمیٹ لیا اور سب سے بڑی بات کہ جل کے بعد سب سے پہلے اسے گلے لگانے والی مہا مچھلی تھی جس کے بارے میں سب گمان کر رہے تھے کہ وہ شاید اسے معاف نہیں کرے گی اور جل کے اُصول توڑنے کے باعث اسے دوبارہ جل میں رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی مگر نہ صرف جل کے پانی نے بلکہ مہا مچھلی نے بھی اسے قبول کر لیا تھا اور وہ سب شکر ادا کر رہے تھے کہ جل کی بپھری لہروں نے اس کی سانسیں نہیں چھینی تھیں ورنہ وہ ساری عمر جل سے باہر کسی جوگن کی طرح بے چین پھرتی رہتی،مگر اب سب سے بڑا مسئلہ جو درپیش تھا کہ وہ تو اپنی لچکیلی دُم جس سے سارے جل میں تیرتی پھرتی تھی،گنوا بیٹھی تھی تو اب وہ جل میں کیسے تیر سکے گی۔سب جل واسیوں کے لیے یہ صورتِ حال کافی پریشان کن تھی لیکن یہ سب باتیں سوچنے کو ابھی کافی سمے پڑا تھا۔فی الحال ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ جل کی رانی جل میں واپس آ گئی ہے۔

وہ ابھی تیر نہیں سکتی تھی لہٰذا رنگیلی مچھلیوں کا ٹولہ خود ہی سمندری کچھوؤں کی مدد سے اسے اُٹھا کر جل محل لے آیا۔سب نے اسے آرام کرنے دیا۔وہ برسوں کے بعد آرام چین

کی نیند سوئی تھی۔انتہائی گہری نیند،جس میں وہ خواب میں ایک بار پھر آدم زاد کے ساتھ تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے، رفتہ رفتہ اس کے سنگ چلتے ہوئے ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئی تھی۔پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ یکا یک آدم زاد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اسے تو ابھی سیدھے راستوں پر بھی چلنا نہیں آیا تھا تو پہاڑ کی چوٹی پہ کیسے چڑھتی پھر اچانک ہی اس کا ہاتھ آدم زاد کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کے ہاتھ چھوڑتے ہی وہ بہت اُونچائی سے گر رہی تھی۔وہ پتھریلی چٹانوں اور نوکیلے پتھّروں پر سے لڑھکتی ہوئی زمین کی سمت آ رہی تھی۔اس کی آنکھیں خوف اور تکلیف کی شدت سے بند تھیں وہ بہت زور سے کسی خنجر نما چٹان سے ٹکرانے والی تھی کہ ایک زوردار دہشت بھری چیخ سے اس کی نیند ٹوٹ گئی۔

آنکھ کھلی تو وہ اپنے سبز مخملیں سمندری گھاس سے بنے ہوئے بستر پہ تھی۔جس کے اردگرد رنگین سمندری پتھّر اور بے حد خوب صورت رنگ برنگے موتی جڑے تھے۔سارا جل اس کے اردگرد اکٹھا تھا اور اس کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا۔اس نے اپنے اردگرد دیکھا تو شانت ہو کر آنکھیں موند لیں۔وہ کتنا ترسی تھی اس طرح کے منظر یاد کر کے۔آج وہ نظارہ ایک بار پھر اس کے سامنے تھا۔کچھ ہی عرصے میں سب کچھ ویسا ہی ہو گیا مگر بدل گئی تھی تو وہ خود...اس کا دل...اس کی سوچیں...اس کے لب ہنسنا بھول چکے تھے۔اتنا پانی شاید پورے جل میں بھی نہیں تھا۔جتنا ہر دم اس کی آنکھوں میں رہنے لگا۔سب جل والے یہ سمجھتے تھے کہ شاید اس کی اُداسی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی لچکیلی دم کھونے کے باعث روانی سے تیرنے سے قاصر تھی اور مدھر آواز بھی کھو چکی تھی۔کچھ آدم زاد کی بے وفائی کو اس کی طویل خاموشی اور نہ ٹوٹنے والی چپ کی وجہ گردانتے تھے۔

رنگیلی مچھلیوں کے ٹولے کا خیال تھا کہ اس کے دل میں اب بھی آدم زاد کی یاد ہلکورے لے رہی ہے۔وہ دل ہی دل میں ان کے قیاسات پہ ہنس رہی تھی۔وہ انھیں کیا بتاتی

کہ بے وفا محبت کی یاد کبھی بھی دل میں باقی نہیں رہا کرتی۔ یا شاید وہ ہی ایسی تھی کہ اس نے آدم زاد کی محبت کو اس کے ہرجائی پن کے بدلے میں اپنے دل سے نکال دیا اور اس مردہ تالاب میں پھینک آئی تھی جہاں غلاظت سے بھرپور دلدل جیسے کیچڑ کا بدبودار ڈھیر تھا جہاں سب جل والے جانے سے اجتناب کرتے تھے کیوں کہ وہاں مردہ سمندری جانوروں کو پھینکا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی بھوری چٹان کے قریب وہ ظالم، بدلحاظ اور غلیظ آکٹوپس رہتا تھا۔ لہٰذا جل پری آدم زاد کی محبت کو بھی وہیں دفنا آئی تھی مگر اس کی بے وفائی کا دُکھ اس کے دل میں دفن تھا۔ سب محبت کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ محبوب اور اس کی یاد کو دل سے نکال پھینکتے ہیں مگر خود سے کی گئی بے وفائی... کبھی نہیں بھولتے۔ اس میں سراسر نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔ جس کا تاوان انھیں عمر بھر ادا کرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی ایک گھاٹے کا سودا کر آئی تھی جس میں اپنا روپ اپنی پہچان اور اپنی آواز تک کھو بیٹھی تھی۔ اس کے دل میں درد کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر قید ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ جل پری سے بنت البحر بنی اور بنت البحر سے ایک بار پھر جل پری بن چکی تھی۔

جل پری نے کسی کو اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں بتایا تھا کہ بنت البحر بننے کے بعد، وہ انسانی دنیا سے آدم زاد کی دان کی گئی ایک نشانی بھی ساتھ لائی ہے اس کے وجود میں دھیرے دھیرے پَل رہی ہے۔ وہ اس بارے میں سوچ سوچ کے شدید پریشانی کا شکار تھی کہ جب مہا مچھلی اور سب جل واسیوں کو اس بارے میں پتا چلے گا تو ان سب کا کیا ردِّ عمل ہو گا کیوں کہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سب جل واسیوں کے دل میں آدم زاد کے لیے سوائے نفرت کے کچھ نہیں ہے اور اَب وہ اس کی ہونے والی اولاد کے ساتھ کیا سلوک کریں... یہ سوچ کر ہی اسے ہول اُٹھ رہے تھے۔ اس سے پھر صبر نہ ہوا اور سب کچھ رنگیلی مچھلیوں کے گوش گزار کر دیا۔ کچھ تو بہت خوش ہو گئیں لیکن باقی سب کا خیال تھا کہ آدم زاد کی بے وفائی اور

بدسلوکی کی وجہ سے سب اس کے بچّے سے نفرت کریں گے۔ ایک نے تو یہ کہہ کے اس کے دل میں بہت خوف پیدا کر دیا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مہا مچھلی اسے جل میں رہنے کی اجازت ہی نہ دے۔ جل پری بہت خوفزدہ ہو گئی۔ اگر ایسی کوئی صورتِ حال پیدا ہو گئی تو وہ اس بچے کو لے کر کہاں جائے گی اور اسے جلد از جلد اس مسئلے کا حل سوچنا ہو گا کیوں کہ وہ زیادہ دیر اس بات کو نہیں چھپا سکے گی۔

’’جل پری‘‘ (حصّہ 16)

وہ جھل مگسی میں اس کا شاید آخری دن تھا۔وہ اپنے گھر کے ایک کمرے میں اندھیرا کیے کسی غیر مرعی نقطے پہ نگاہیں مرکوز کیے بیٹھا تھا۔وہ آج بہت سوچ بچار کے بعد جل پری کو اسی جل میں واپس چھوڑ آیا تھا جہاں وہ اسے پہلی مرتبہ ملی تھی۔اسے گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے یاد آرہے تھے۔وہ شروع شروع میں اس کی صحبت میں بہت خوش وخرم رہتا تھا اور لگتا تھا کہ ساری کائنات کی دولت اسے مل گئی ہے لیکن رفتہ رفتہ جب کاروبار کے معاملات بھی مزید پھیل گئے اور دیگر بہت سارے مسائل سامنے آئے تو اسے اپنے بے وقوفانہ فیصلے پہ پچھتاوا ہونے لگا۔حسن کی وہ دیوی اسے اب اپنی نا سمجھی اور بھولے پن کی وجہ سے جاہل، اجڈ اور گنوار دکھائی دینے لگی۔ایک طرف الوینہ تھی۔نفاست اور شائستگی کا شاہکار اور اس کے کاروبار کے معاملات میں اس کی ہم قدم جب کہ دوسری طرف ایک گونگی، بدتہذیب، جنگلی لڑکی۔جسے چلنے پھرنے سے لے کر اُٹھنے بیٹھنے تک کی کوئی تمیز نہیں تھی۔وہ

انتہا درجے کی خود غرضی اور مطلب پرستی سے خود سے ہی سوال جواب کر کے دونوں کا موازنہ کر رہا تھا اور اگر اس وقت اس کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یقیناً جل پری کو چھوڑ کر الوینہ کا انتخاب کرتا۔ جب انسان اپنے ضمیر کے خلاف جا کر خود غرضی سے کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اس کا ضمیر اسے اندر ہی اندر ضرور ملامت کرتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو حق بجانب قرار دینے کے لیے دوسرے کی خامیاں اور کمزوریاں تلاش کرتا رہتا ہے اور وہ بھی اس وقت ایسا ہی کر رہا تھا۔ دوسرا اس کے پاس الوینہ کو منتخب کرنے کی ایک اور توجیح بھی تھی جو ان سب پہ بھاری تھی کہ جل پری کا انتخاب باپ کی ناراضگی کا سبب بنتی اور اس کی ساری عمر کی محنت اور ریاضت کے صلے میں جب فصل کاٹنے کا وقت آیا تو اس نے جل پری کو گلے لگا لیا اور اَب بعد کی جو صورتِ حال تھی وہ مزید گھمبیر ہوگئی تھی جب اسے پتا چلا تھا کہ اس کے وجود میں ایک اور سمندری یا انسانی وجود پرورش پا رہا ہے۔ اب اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ اسے جل میں چھوڑ آئے۔

وہ اسے کوئی نقصان نہیں دینا چاہتا تھا اور اس نے اپنے تئیں کوشش بھی کی کہ وہ بیپی کے ساتھ سیٹ ہو جائے مگر وہ اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ کسی طرح بھی ایڈجسٹ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بار بار خود کو تسلی دے رہا تھا کہ اس نے یہ سب ٹھیک کیا ہے۔ اچھا ہے وہ... وہیں کی تھی اور اسے واپس وہ ادھر ہی چھوڑ آیا۔ اب وہیں خوش رہے گی۔ وہ بار بار ایک ہی بات دہرا رہا تھا۔ اس دن اسے ہمیشہ کے لیے واپس چلے جانا تھا کیوں کہ ریسٹ ہاؤس کا کام تقریباً آخری مراحل میں تھا لیکن وہ رات یہیں رکنا چاہتا تھا۔ وہ جانے کے لیے پر تول رہا تھا مگر قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔ اس کے دل میں شدید درد اُٹھا تھا۔ جس جگہ کھڑا تھا وہیں زمین پہ بیٹھ گیا۔ وہ پتا نہیں کتنا وقت وہاں پڑا رہا۔ رات بیت رہی تھی۔ اس نے دیکھا، جل پری اس کے پاس کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں وہ پر تھا جو اس نے نوچ ڈالا تھا... وہ دوسرا پر توڑ

کے اسے دے رہی تھی لیکن وہ نہیں لے رہا تھا.. نہیں نہیں... جل پری... اگر دوسرا پر بھی ٹوٹ گیا تو تم کبھی زمین پہ نہیں آسکو گی۔ وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے پر توڑنے کو کہہ رہی تھی۔ وہ زور زور سے چلا رہا تھا۔ یکا یک اس کی آنکھ کھل گئی۔ خواب ٹوٹ چکا تھا۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل جل پری یہاں کھڑی تھی۔ مگر وہ یہاں کیسے آسکتی تھی۔ اس نے تو اس کے پر نوچ ڈالے تھے۔ وہ شدید کوفت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسے اب ایک دن بھی یہاں نہیں رہنا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ کل صُبح ہوتے ہی جھل مگسی سے روانہ ہو جائے گا۔

اگلے دن منہ اندھیرے ہی وہ جھل مگسی سے روانہ ہو گیا۔ اس کے دل میں ایک خواہش نے سر اُٹھایا کہ وہ جانے سے پہلے آخری بار اسی پتّھر کنارے جائے اور دیکھے کہ جل پری کے ساتھ کیا ہوا مگر وہ نہ گیا شاید اسے یہ دھڑکا لگا تھا کہ جل پری ساحل پہ ہی کہیں موجود نہ ہو (مگر وہ کیسے ٹوٹے پروں سے جی سکتی ہے۔ اس نے خود کو ہی جواب دیا)۔ ہاں تو وہ پانی کے اندر چلی گئی ہو گی آخر کو وہیں تو رہتی تھی۔ (مگر اس نے تو انسانی روپ لے لیا تھا) وہ کیسے تیر پائے گی۔ اس کا ضمیر اس سے سوال کر رہا تھا۔ وہ سخت جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا۔ اس وقت تو اس نے ان آوازوں پہ کان نہ دھرا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ اگلی ساری عمر یہ آوازیں اس کا پیچھا کریں گی۔ کسی کے ساتھ کی گئی زیادتی تاعمر حساب لیتی رہتی ہے۔ مکافاتِ عمل کی چکی میں پستا انسان... نہ جیتا ہے نہ مر سکتا ہے۔

وہ لاہور واپس آ گیا تھا۔ دل پہ منوں کے حساب سے بوجھ لیے۔ گھر پہنچتے ہی الوینہ اور آنٹی دُردانہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ اس پہ کافی دن سے دباؤ ڈال رہی تھیں کہ وہ بنت البحر کو چھوڑ دے کیوں کہ ان کی رخصتی کی تاریخ فکس ہو گئی تھی اور الوینہ اب کسی بھی صورت اس گنوار لڑکی کو اپنے ہونے والے شوہر کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ پپی والے واقعے کے بعد ضرار اسے اپنے ہمراہ دوبارہ یہاں نہیں لایا تھا اور الوینہ کے دل

و دماغ میں یہ بات پختگی سے بیٹھ چکی تھی کہ ضرار جب تک اسے چھوڑ نہیں دیتا۔ وہ دو کشتیوں میں ہی سوار رہے گا۔ اس نے جاتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ وہ بنت البحر کو ہمیشہ کے لیے اس کے والدین کے گھر چھوڑ آئے گا اور واقعی میں اس نے اپنا کہا پورا کر دکھایا۔ دولت، طبقاتی فرق، اسٹیٹس آج ایک بار پھر بے چارگی، کمزوری اور مظلومیت پہ سبقت لے گیا تھا۔

وقت کا کام آگے ہی آگے بڑھنا ہے۔ وہ کبھی رکتا نہیں۔ بنت البحر کے جانے کے بعد الوینہ رخصت ہو کر اس کے گھر آ چکی تھی۔ دُردانہ بیگم اور الوینہ کا مطلب پورا ہو چکا تھا۔ ہشام صاحب نے دُردانہ بیگم کے سمجھانے بجھانے پہ سارے بزنس میں ضرار اور الوینہ کو مشترکہ پارٹنر بنا دیا۔ اس کی شادی ہوئے پورے دو ماہ ہو گئے تھے۔ دولت کی ریل پیل، خوب صورت بیوی، گھر، بینک بیلنس سب کچھ تو تھا اس کے پاس مگر ایک چیز نہیں تھی... سکون... جس کی کمی تا عمر پوری نہیں ہونی تھی۔ وہ شدید قسم کی ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔ کچھ ہی عرصہ میں اس کی حالت تشویشناک ہو گئی۔ وہ کبھی کبھار بالکل ٹھیک ہوتا مگر اچانک ہی ایسا دورہ پڑتا کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔

کل سے اس کی حالت بہت بری تھی۔ الوینہ اور اس نے ایک پارٹی میں جانا تھا۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس کے مجبور کرنے کی وجہ سے تیار ہونے لگا۔ تیار ہو کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا تھا۔ ساتھ ہی الوینہ آ کے کھڑی ہو گئی۔ وہ بغور دیکھنے لگا۔ دفعتاً الوینہ کی جگہ جل پری کا عکس ابھر آیا۔ اس کے ماتھے کے سب پر ٹوٹے ہوئے تھے۔ وہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی... وہ پیچھے پیچھے سرکنے لگا... نہیں... نہیں... جل پری... میں نے کچھ نہیں کیا... مجھے معاف کر دو۔ وہ پہلے زور زور سے چلا رہا تھا... پھر چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے باآوازِ بلند رونے لگا... الوینہ کے لیے اس کی دماغی حالت ایک معمہ بنتی جا رہی تھی۔ وہ کچھ ہی دیر میں بیڈ پہ نیم دراز سو چکا تھا۔ الوینہ نے غصّے سے پاؤں پٹخے اور اکیلی ہی پارٹی میں شامل

ہونے چل دی۔

اس دن تو انتہا ہی ہوگئی۔ جب آنٹی دُردانہ نے لاؤنج میں بیٹھے سب کی موجودگی میں اسے چھیڑ دیا کہ نئے مہمان کی آمد کا اعلان کب کرو گے تم دونوں... الوینہ ہنس کے چپ ہو رہی۔ اسے بچے پسند نہیں تھے اور نہ ہی فی الحال اس کا ارادہ تھا۔ وہ سب جو پہلے ٹیلی وژن کی طرف متوجہ تھے۔ اچانک سے ضرار کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کے پورے بدن میں کپکپی طاری تھی۔ اچانک ہی وہ آپے سے باہر ہو گیا اور زور زور سے چلانے لگا۔ میں نے کچھ نہیں کیا جل پری... میں نے تمہارے بچے کو نہیں مارا... میں نے کچھ نہیں کیا۔ وہ سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ ہشام صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔ دُردانہ بیگم نے ان کی طرف دیکھ کے کہا! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ضرار کافی دن سے اس قسم کی حرکتیں کر رہا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر گہری سوچ میں مبتلا ہو گئے۔ گزشتہ کافی روز سے وہ اس کی حالت دیکھ رہے تھے اور دُردانہ بیگم اور الوینہ بھی اس کے عجیب و غریب رویے کی شکایت کر رہی تھیں۔ آج تو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ وہ پھر بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ !وہ دیکھو... جل پری کی لاش پڑی ہے اور تو اور میں نے اس کے بچّے کو بھی مار ڈالا۔ وہ دیکھو! وہ اس کے بچے کی لاش پڑی ہے۔ میں نے سب ختم کر دیا۔ الوینہ اور دُردانہ بیگم چوں کہ بنت البحر سے واقف تھیں۔ لہٰذا جل پری کا نام سُن کر وہ بھی بری طرح پریشان ہو گئیں کہ اب یہ کون ہے جس کا ضرار کی زندگی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق ہے۔

رات ہوتے اسے سخت بخار نے آ گھیرا۔ ڈاکٹر نے جسمانی سے زیادہ اسے کسی ذہنی اُلجھن کا شکار قرار دیا۔ الوینہ اور دُردانہ بیگم کے لیے اب وہ ایک بوجھ سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کی حالت مزید خراب ہوتی اور الوینہ اور دُردانہ بیگم اسے فالتو سامان کی طرح اُٹھا کر باہر پھینک دیتیں۔ ہشام صاحب نے اسے اس کی گرتی ہوئی صحت اور ذہنی

کیفیت کی وجہ سے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کروا دیا جہاں دو ماہ تک اس کا پوری طرح سے علاج ہوتا رہا۔ دو ماہ بعد اسے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ باقاعدگی سے علاج معالجے کی بدولت وہ کافی حد تک ٹھیک ہو گیا تھا مگر اس نے ایک مسلسل نہ ختم ہونے والی چپ کی چادر تان رکھی تھی۔ ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے جس نے اس کے دماغ پر گہرا اثر کیا اور اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔

''جل پری''(حصّہ 17)

سمندری گھوڑا ہفتہ بھر سے اپنے وہ جنتر منتر پڑھ رہا تھا کہ جس سے وہ جل پری کی کھوئی ہوئی آواز واپس لاسکے۔سمندری گھونگے اور مچھلیاں روز سمندری گھوڑے کو ساحل کنارے کی سیلی مٹّی لاکر دیتے جس پر پڑھے گئے منتروں سے اس کی کھوئی ہوئی آواز واپس آجانی تھی۔جسے اس کی جل بدری کے وقت سیپ میں بند کر کے سمندر کی سب سے آخری تہہ میں دفنا دیا گیا تھا، جوں جوں منتر پڑھے جارہے تھے۔سیپ جو جتنی مضبوطی کے ساتھ بند ہوا تھا اتنی ہی مشکل سے کھل رہا تھا اور آواز کی لہریں رفتہ رفتہ اس میں سے باہر آرہی تھیں۔جل پری کو آواز کا نذرانہ دان کرتے ہوئے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی یا شاید اس وقت اس پہ انسانی دنیا میں جانے اور آدم زاد کی محبت حاصل کرنے کی دھن سوار تھی لیکن اب کی بار جب کہ اس کی اپنی ہی آواز واپس لوٹ رہی تھی تو وہ شدید کرب اور تکلیف سے گزر رہی تھی اور ان کی دن رات کی کوششیں بالآخر کارگر ثابت ہوئیں۔اس سیپ سے وہ آواز واپس نکال لی گئی جو جل پری سے جل بدری کے عوض چھین کر اس میں بند کر دی گئی تھی۔

آواز کے سیپ سے باہر آتے ہی اس کی قوت گویائی بحال ہوگئی۔سیلی مٹّی پر پڑھے گئے جنتر منتر ایک بار پھر کام کر گئے اور وہ دن سب جل واسیوں کے لیے انتہائی خوشی کا دن

تھا جب وہ ایک بار پھر سے بولنے کے قابل ہوگئی مگر جب کوئی خود ہی بولنا نہ چاہے تو قوت گویائی ہونے یا نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا اور وہ نہ صرف ہنسا بولنا بھول چکی تھی بلکہ اسے اپنے وہ تمام مدھر گیت بھول چکے تھے جو وہ اپنی ہمجولی رنگیلی مچھلیوں کے سنگ گایا کرتی تھی۔ وہ پہروں ایک ہی جگہ خاموش بیٹھی رہتی۔ پتا نہیں وہ بولنا ہی نہیں چاہتی تھی یا اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ من کا خالی پن اسے بس ہمہ وقت سوز و گداز میں مبتلا رکھتا اور سب نے جان لیا کہ اس کی خاموشی کی وجہ اس کی قوت گویائی سے محرومی نہیں بلکہ اُجاڑ دل کی ویرانی تھی جو آواز واپس آ جانے کے باوجود بھی دل پہ پھیلے اُداسی کے تاریک سائے اور لبوں پر لگے قفل نہ توڑ سکی۔ سارا جل اس کو خوش رکھنا چاہتا تھا مگر اس کے لب ہنسا تو درکنار بولنا بھی بھول چکے تھے۔ ایسے میں مہا مچھلی نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

اسے تیرنے میں کافی مشکل پیش آ رہی تھی کیوں کہ وہ اپنی لچکیلی دم جس سے وہ سارے جل میں اٹھکیلیاں کرتی پھرتی تھی اور رنگیلی مچھلیوں کی ہمراہی میں خوشیوں کے ہنڈولے میں رقصاں رہتی تھی۔ اسے گنوانے کے بعد وہ تہی دست تھی۔ کھوئی ہوئی آواز تو لوٹ آئی لیکن سمندری گھوڑے نے آخری حد تک کوشش کر دیکھی کہ کوئی ایسا طریقہ ہو جس سے اس کی دُم بھی واپس آسکے مگر اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں بھی زندگی میں ہونے والے بعض نقصانات ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی تلافی عمر بھر نہیں ہو سکتی اور ہجر کے صدمے اور جدائی کے الاپتے راگ کے ساتھ جنموں سے عطا کردہ روپ بدلنا اسے ایک ایسے خسارے سے دو چار کر گیا کہ جس کا تاوان اسے جنم بھر ادا کرتے رہنا تھا۔ اس کے جسم پہ لگے وہ خوب صورت نگینے جو رات کی روشنی میں جگر جگر کرتے تھے۔ وہ بھی روپ بدلتے سمے چوں کہ سب غائب ہو چکے تھے اور انہی کی مدد سے وہ راتوں کو بآسانی دیکھ سکتی تھی مگر اب وہ تیرتے ہوئے تھوڑی دیر میں ہی بہت جلد تھک جاتی تھی لہٰذا اسے جل میں اِدھر اُدھر جاتے ہوئے کسی نہ کسی سہارے

کی ضرورت پڑتی تھی کیوں کہ وہ اپنی دم کے بغیر ادھوری رہ گئی تھی تب ہی مہا مچھلی نے فیصلہ کیا کہ کسی جل واسی کو اس کی زندگی کا ساتھی بنا دیا جائے۔ مہا مچھلی نے اسے اپنی پسند بتانے کا پورا اختیار دیا تھا۔ وہ سُن کے ہنس پڑی تھی۔ کیا وہ اس قابل رہ گئی تھی کہ اب اپنی پسند کا جیون ساتھی چنتی۔ پورے جل میں ہلچل مچ گئی۔ کئی ایسے تھے جو جل پری کے آدم زاد کے ساتھ جانے سے پہلے اس کے ساتھ زندگی بتانے کے خواب دیکھا کرتے تھے لیکن جب جل پری ان سب کو رد کر کے آدم زاد کے ساتھ چلی گئی تھی تو ان کے خواب ادھورے رہ گئے تھے۔ اب انھوں نے دوبارہ سے جل پری کو حاصل کرنے کے سپنے دیکھنے شروع کر دیے اور کئی ایک نے تو سامنے آ کر جل پری کو اپنانے کی خواہش بھی ظاہر کر دی۔ ہر کوئی اسے اپنی وفاداری کا یقین دلا رہا تھا۔ اسے خوش رکھنے کے وعدے کر رہا تھا مگر وفاداریوں کے جھانسے اور عیاریوں سے لے کر مکاریوں تک وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھ چکی تھی بلکہ اچھا خاصا خمیازہ بھی بھگت چکی تھی لہٰذا پیار و محبت اور عشق کے پھینکے گئے کسی بھی جال میں پھنس کر دوبارہ اپنے آپ کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی مگر جس گھڑی اس کا انکار سب جل واسیوں کے خوابوں پر پانی پھیر رہا تھا... تقدیر اپنی چال چلنے کو پر تول رہی تھی اور سمے کی دھارا نے اسے مقرّر کردہ وقت پر اپنے بے رحم پنجوں میں جکڑ لینے کے بعد اس سے ایسا فیصلہ کروا لیا کہ جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ جو انتہائی سختی سے اکیلے زندگی گزارنے کے فیصلے پہ ڈٹی کھڑی تھی۔ تقدیر اس پہ اپنا وار چل گئی۔ جب انسان اپنی زندگی اور مستقبل کے بارے میں بڑے بڑے دعوے کر رہا ہوتا ہے اور منصوبے بنا رہا ہوتا ہے تو وقت خاموش تماشائی بنا اس کا تمسخر اُڑا رہا ہوتا ہے۔

دراصل، جل پری کو چند دن سے وہ بھیانک آکٹوپس جو مردہ تالاب کے پاس بھوری چٹان میں رہتا تھا۔ اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کر رہا تھا یا شاید وہ دانستا اس کی

گرفت میں آ گئی تھی۔ اس دن جب وہ رنگیلی مچھلیوں کے سنگ پانی میں تیرنے کی مشق کر رہی تھی تو اس کا دل بہلانے کے لیے وہ سب اسے اپنے گھیرے میں لیے جل میں بہت گہرائی تک نکل آئیں مگر جیسے ہی ان کی نظر بھوری چٹان پہ پڑی وہ گھبرا کر رُک گئیں اور جب رنگیلی مچھلیوں کا ٹولہ بھوری چٹان سے کچھ پہلے ہی واپس مڑنے لگا تو اسے پتا نہیں کیا سوجھی کہ اس نے کہا مجھے بھوری چٹان میں جانا ہے۔ رنگیلی مچھلیوں نے اسے سختی سے منع کیا کہ مہا مچھلی کے حکم کے مطابق بھوری چٹان کے قریب کبھی کوئی نہیں جا سکتا کیوں کہ وہاں وہ ایک آنکھ والا کانا، سیاہ بدنما دیوہیکل ''آکٹوپس'' رہتا ہے اور کوئی بھی وہاں جانے کی کوشش نہیں کرتا تھا بلکہ سب اس بھوری چٹان کے قریب سے بھی گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

وہ بھوری چٹان چوں کہ اس آکٹوپس کی ملکیت تھی جسے اس کی حکم عدولی کی وجہ سے جل بدر کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد بھوری چٹان کو اس نے اپنا مسکن بنا دیا تھا۔ یہ سارے جل سے ہٹ کر بنی ہوئی تھی جو اندر سے بہت گہری تھی۔ پھر جب تقدیر میں گردش لکھی ہو تو انہونی بھی ہو کر رہتی ہے اور ایسے واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں جن کے بارے میں کبھی تصور بھی نہیں کیا گیا ہوتا تو ایسے ہی ایک دن بدقسمتی جل پری کو مکار آکٹوپس کے ٹھکانے تک لے آئی پتا نہیں اس کی آنکھوں پر اس لمحے وقت کے بے رحم ہاتھوں نے پٹی باندھ دی تھی یا وہ جان بوجھ کر اپنے آپ سے انتقام لے رہی تھی اور اگر انسان کو جانے انجانے میں اُٹھائے، اپنے کسی قدم کے بارے میں قبل اَز وقت چل جائے تو وہ بھول کر بھی وہ فیصلہ نہ کرے۔

’’جل پری‘‘(حصّہ 18)

بعض اوقات انسان کوئی کام نہیں کرنا چاہ رہا ہوتا اور دل و دماغ کی چپقلش کے باعث حالات سے مجبور ہو کر کوئی کام کر گزرتا ہے جو اس کی زندگی کو ہی ملیا میٹ کر دیتا ہے کیوں کہ ایک باضمیر شخص کا دماغ اسے ضرور کچوکے لگاتا ہے بے حس ہونے کے لیے ضمیر کا مردہ ہونا بہت ضروری ہے۔ضرار بھی دو ماہ تک شدید ذہنی تناؤ میں مبتلا رہنے کے بعد زندگی کی طرف تو واپس لوٹ آیا مگر کائنات صرف لاشعور میں ٹھہرے لمحات پہ آ کے رُک گئی تھی۔ شعور و آگہی میں ہلچل مچ گئی تھی جب سے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔جل پری کے ساتھ کی گئی زیادتی اور بے وفائی اسے چین سے جینے نہیں دے رہی تھی۔ہشام صاحب کے بارہا پوچھنے پہ بھی اس نے ذہن کی مقفل گرہیں ان کے سامنے نہ کھولیں۔اس نے اندر ہی اندر ایک فیصلہ کر لیا تھا۔وہ جل پری کو ایک بار پھر سے تلاش کرے گا۔پوری دنیا چھان مارے گا۔آخر کہیں نہ کہیں تو اس کا سراغ مل ہی جائے گا۔وہ ایک بار مل جائے تو وہ اسے یقین دلا دے گا کہ وہ اس سے بے انتہا محبت کرتا ہے اور اس سے جدا ہو کر ایک پل بھی چین سے نہیں رہا لیکن

اسے اندازہ نہیں تھا کہ اذیتوں کے خلفشار میں بھٹکنا ہی اب اس کی زندگی بن جائے گا۔

الوینہ نے اسے پاگل کہہ کر اس سے علیحدگی کا اعلان کر دیا تھا اور دُردانہ بیگم اس کے اس فیصلے میں اس کے ساتھ تھیں۔ ضرار کے لیے نہ ہی الوینہ میں کوئی دلچسپی رہی تھی نہ ہی بزنس کے معاملات میں۔ اس نے باپ کی بے انتہا مخالفت کے باوجود اسے آزاد کر دیا تھا۔ اسے اپنی ذہنی حالت کا اندازہ تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے زبردستی باندھے رکھے۔ وہ جل پری کے بچھڑ جانے کے کچھ عرصہ بعد ہی پچھتاوے کے احساس سے دوچار ہو گیا تھا۔ محبت اور اس سے بچھڑنے کے احساس سے زیادہ اس کے ساتھ کی گئی زیادتی کا احساس نہ اسے جینے دے رہا تھا اور نہ مرنے۔ اس کا دل ندامت سے ہر دم اسے کچوکے لگاتا تھا۔ وہ اپنی ذہنی حالت کے بہتر ہونے کے بعد بھی ایک نہ ختم ہونے والی اذیت میں گرفتار تھا۔ کسی معصوم اور بے گناہ کے ساتھ کی گئی زیادتی ایک باضمیر انسان کو جیتے جی مار دیتی ہے۔ اسے ہر طرف سے جل پری کی آوازیں آتیں تھیں۔ کبھی گھر میں باغ کے جھولے میں بیٹھی سمندری زبان کے سریلے گیت گا رہی ہوتی وہ بھاگ کے اس کے پاس جاتا تو وہ ہنستی ہوئی کہیں دُور جا کھڑی ہوتی۔ اس کی حالت اگر بہتر بھی ہو گئی تھی تو ان یادوں کا کیا کرتا جو کسی سادھو کی طرح دل و دماغ میں ایک جگہ ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئی تھیں۔

جب کسی پَل بھی چین نہ آیا تو اس نے بحری سفر شروع کر دیے۔ اس نے سُن رکھا تھا کہ کھوئی ہوئی چیزیں اسی جگہ سے واپس ملتی ہیں جہاں سے گم ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ یہ سوچ لیے کئی بار جھل مگسی بھی آیا اور سارا سارا دن اسی پتّھر پر آ کے بیٹھا رہا۔ اس اُمید پہ کہ شاید جل پری ایک بار پھر اسے مل جائے۔ مگر وہ پاگل تھا۔ کھوئی ہوئی محبت تو شاید کبھی مل ہی جاتی ہو لیکن اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کا گلا گھونٹنے والے ساری عمر پھرنا کام و نامراد رہتے ہیں۔ وہ بھی پاگلوں کی طرح تمام ساحلوں کی خاک چھانتا رہا مگر وہ اسے نہ ملی۔ اس نے جھل مگسی کا

چپہ چپہ چھان مارا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بار اسے وہ مل جائے تو وقت ثابت کر دے گا کہ وہ اس کے لیے کس قدر تڑپا ہے لیکن بعض اوقات وقت کے ثابت کرنے تک انسان خود ہی نہیں رہتا۔

اس دن ہشام صاحب نے بالآخر اس سے وہ سوال پوچھ ہی لیا جس سے وہ ڈرتا تھا۔ چشم پوشی سے کام نہیں بنتا تھا جب تک کہ حقیقت حال ان کے سامنے نہ آتی۔ وہ چائے پی رہے تھے۔ ضرار پاس ہی بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ وہ روزانہ کے اخبار دیکھتا کہ کہیں نہ کہیں اسے جل پری کی بھنک مل جائے۔ اچانک کمرے میں چھائے سکوت کو ہشام صاحب نے توڑا... یہ جل پری کون ہے؟ وہ حیران سا ہو کر انھیں دیکھنے لگا۔ وہ اس کی خاموشی دیکھ کر پھر گویا ہوئے۔ دیکھو ضرار! خاموشی کسی مسئلے کا حل نہیں۔ وہ پریشان ہو گیا کہ ان کو کس نے بتایا ہے۔ اس سے قبل کہ وہ پوچھتا، وہ خود ہی بول پڑے، دراصل تم بے ہوشی کے عالم میں ایک ہی نام بار بار لیتے رہے۔ وہ سخت گھبرا گیا۔ اس کی حالت غیر ہوتی دیکھ کے انھوں نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی لیکن دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اس کی تہہ تک ضرور پہنچیں گے۔ وہ اس کا جواب نہ پا کر ٹی وی پہ نگاہ مرکوز کر چکے تھے لیکن اس کی نظر اخبار میں لکھی ایک خبر پہ پڑ چکی تھی جس میں بحری جہاز کے کسی سفر کی تفصیلات لکھی تھیں۔ وہ شوق سے پڑھنے لگا۔ اس کے دماغ میں ایک نیا خیال آ گیا تھا۔ جوں جوں پڑھتا جا رہا تھا۔ امید کی ایک کرن سی دل میں جاگ گئی تھی۔

''جل پری''(حصّہ 19)

سارا جل جانتا تھا کہ وہ ایک انتہائی جھوٹا دھوکے باز، مکار اور چالاک آکٹوپس ہے۔ اس کے آٹھ ہاتھ تھے۔ سیاہ مائل بھورے رنگ کا بدہئیت، ایک آنکھ سے سارے جل کو شکار کرنے کا گر رکھتا تھا۔ اصل میں اس کی چرب زبانی اور حلاوت آمیز لہجہ اس سے واقفیت نہ رکھنے والوں کو اپنے دام میں بآسانی گرفتار کر لیتے تھے۔ جیسے ہی آکٹوپس کو پتا چلا کہ جل پری اس آدم زاد سے دھوکہ کھا کر انسانی دنیا سے واپس جل میں آ گئی ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیوں کہ وہ تو ازل سے جل پری کی آس لگائے بیٹھا تھا اور اس وقت اس کے ارمانوں پہ اوس پڑ گئی تھی جب جل پری جل کے ساتھ ساتھ اس کے دل کو بھی ویران کر کے انسانی دنیا میں چلی گئی تھی اور اَب اس کی جل میں واپسی کے بعد سے وہ اس کی اپنی زندگی میں شامل ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی قسمت کی ستم ظریفی سے جل پری بھوری چٹان میں داخل ہوئی تو آکٹوپس کی تو جیسے من کی مراد پوری ہو گئی۔ وہ اس قدر چالاک و مکار ہونے کے باوجود جل پری سے ایسے خوش اخلاقی اور مروت سے ملا کہ چند لمحے کے لیے جل پری

بھول ہی گئی کہ وہ اس وقت اس بھوری چٹان میں کھڑی اس مکار آکٹوپس سے مخاطب ہے جو اپنی عیاری و چالاکی کے لیے سارے جل میں بدنام ہے اور جس سے ملنے جلنے اور تعلق رکھنے سے مہا مچھلی نے انتہائی سختی سے منع کر رکھا ہے۔

وہ جل پری کے آنے پر انتہائی خوشی کا اظہار کرنے لگا اور اسے اپنی اس نام نہاد محبت کی جھوٹی کہانی سنانے لگا جو بقول اس کے بہت عرصے سے اس کے دل میں ڈیرہ ڈالے بیٹھی تھی اور اپنی بے قراریوں کے قصّے، جب جل پری نے ایک آدم زاد کا انتخاب کیا تھا۔ جل پری نے اس وقت اس کی کہی کسی بات پر یقین نہ کیا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی، وہ عشق کے خارزاروں پہ ایک عمر برہنہ پا چلی تھی۔ اب اس کی جھولی خالی تھی، من کے آنگن میں کھنکتے محبت کے انمول سکے کوڑیوں کے مول بکے تھے۔ آکٹوپس کی باتوں نے اسے ماضی میں بیتا ایک ایک پَل یاد کروا دیا جسے وہ کبھی بھولے سے بھی نہیں دہرانا چاہتی تھی۔ وہ بنا کچھ کہے وہاں سے چلی آئی۔ اس کے دل میں ایک سوچ نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ اس پورے جل میں اسے یہیں اُمید کی کرن دکھائی دی۔ اگر اس کے بچے کو جل نے پناہ نہ دی اور جل بدری کا فیصلہ سنایا تو وہ بھوری چٹان میں پناہ لے سکتی ہے۔ اس کی آنکھیں یہ سوچ کر چمک اُٹھیں۔ اب یہی آخری حل بچا تھا۔ وہ اس سے اپنے ہونے والے بچے کے بارے میں عہد و پیمان لینے لگی۔ آکٹوپس کی تو جیسے دل کی مراد پوری ہوگئی پتا نہیں اس کی سازش کے تانے بانے ہی اس قدر مضبوط تھے کہ وہ اس کے جال میں پھنس گئی یا وہ جان بوجھ کر دھوکہ کھا رہی تھی۔ بہر حال جو بھی تھا اس نے اسے اپنی میٹھی باتوں سے بہت جلد قائل کر لیا۔ جب جل پری نے اسے کہا کہ وہ اب کسی کو بھی اپنے جیون کا ساتھی نہیں بنانا چاہتی تھی تو وہ اپنی موٹی اور بھدی آواز میں بولا کہ ’’بس اگر کسی کو بھی نہیں بنانا تھا تو مجھے ہی بنالو دیکھنا تو تمہارے لیے جنّت زمین پر لے آؤں گا۔ تمہیں بہت جلد جل بدر کر دیا جائے گا اور سب جل واسی مل کر تمہارے

بچے کو مار ڈالیں گے۔ جل پری کو جنّت کی خواہش نہیں تھی نہ ہی بھوری چٹان سے کوئی غرض تھی۔ ایک بار دل کی دنیا اُجڑ جائے تو سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے۔ جل پری کو بھی اب کسی کے ساتھ اور محبت کی ضرورت نہیں تھی۔ دل کی بستی اجڑنے کے بعد دوبارہ بسانا ایسے ہی تھا جیسے کہ دوسرا جنم لینا اور اسے معلوم تھا کہ اسے اچھے سے اچھا ساتھی ابھی بھی مل سکتا ہے لیکن اب وہ خود اچھی نہیں رہی تھی۔ ایک دھتکاری ہوئی ادھوری جل واسی جو نہ پوری عورت بن سکی۔ نہ ہی جل پری رہی تھی۔ لہٰذا اسے کسی ایسے کو اپنی زندگی سونپ دینی چاہیے جو اس کے ساتھ ساتھ اس کے ہونے والے بچے کی جان بھی بچا سکے۔ بس یہ خیال دل میں آتے ہی اس نے فیصلہ کرنے میں کچھ ہی پل لگائے لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اب کی بار سر سے آسمان چھننے کے بعد پاؤں کے نیچے سے زمین بھی کھسکنے والی ہے۔

مہا مچھلی نے اس کا فیصلہ سُن کر سر پیٹ لیا۔ وہ اس کی دماغی حالت پہ شک کرنے لگی مگر وہ اپنے ہی فیصلے پہ مصر تھی یہ نہیں تھا کہ اسے آکٹوپس سے محبت ہوگئی تھی لیکن یہ یقین ضرور آچکا تھا کہ آکٹوپس اس کی محبت میں مبتلا ہو چکا ہے اور اس کے بچے کو اس کے علاوہ کوئی نہیں بچا سکتا۔ ادھر مہا مچھلی اسے ہر وقت مجبور کرتی رہتی تھی کہ وہ اکیلے زندگی نہیں گزار سکتی اور اسے اب کسی کو زندگی کا ساتھی چن لینا چاہیے۔ تب ہی اس نے یہ فیصلہ کر لیا۔ مہا مچھلی نے تو سرے سے انکار کر دیا۔ یہ سراسر خودکشی کے مترادف تھا۔ اس سے تو ساری عمر ہی جل پری بغیر کسی جیون ساتھی کے گذار دیتی۔ سب جل واسی اس سے ناراضگی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ اس بار سب کی مرضی کے خلاف جا کر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ آکٹوپس ایک گھاگ شکاری تھا اسے پتا تھا کہ جل پری کا دل اندر سے اگر موم نہیں بھی ہوا تو وہ اپنے بچے کی زندگی بچانے کی خاطر راضی ہوئی ہے اس لیے اس نے نئے نئے حربوں سے اسے مزید رام کرنا چاہا وہ آٹھ ہاتھوں سمیت اس کے پاؤں پڑ رہا

تھا اس کے آگے ہاتھ پھیلا کر اپنی محبت کے واسطے دے رہا تھا دیکھو سب جل واسی میرے بارے میں جھوٹی باتیں پھیلا رہے ہیں۔ دیکھو تو میں نے تمہارے استقبال کے لیے بھوری چٹان کیسے سجائی ہے۔ اندر بس محبت بھری جنّت ہی ہے۔ اسے شدید اشتیاق نے آ گھیرا وہ گھاگ اس کا، دل پگھلتا محسوس کر چکا تھا۔ وہ ایک مرتبہ بھوری چٹان کو اس دن دیکھ چکی تھی جب پہلی مرتبہ آکٹوپس سے ملی تھی اور دوسری مرتبہ اب دیکھ رہی تھی... اس دن تو اُو پری انداز میں دیکھی تھی آج آکٹوپس نے اسے بہت سجایا تھا۔ مکار آکٹوپس نے اس کا دل پگھلانے کے لیے ہر طرف رنگ برنگ پھُول لا کر سجائے تھے لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ پھول محض دھوکا اور فریب سے اسے پھانسنے کے لیے ہیں۔ آخر کار وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا۔ وہ شاید جان بوجھ کر اس کے جھانسے میں آ گئی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ جل واسیوں کے سمجھانے بجھانے پہ راضی ہی ہو جاتی اور آکٹوپس کے ساتھ شادی کے فیصلے سے پیچھے ہٹ جاتی اگر اس نے مہا مچھلی اور سمندری گھوڑے کے مابین ہونے والی گفتگو نہ سُن لی ہوتی۔

چند دن پہلے وہ جب رنگیلی مچھلیوں کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد جل محل میں داخل ہوئی تو اس نے مہا مچھلی اور سمندری گھوڑے کے درمیان ہونے والی گفتگو سُن لی تھی۔ اس کے کانوں نے سنا جب سمندری گھوڑا مہا مچھلی سے مخاطب تھا۔ مہا مچھلی! اگر جل پری اس آدم زاد کے ساتھ شادی کے بعد اس کی ہونے والی اولاد یہاں لے آتی تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتیں۔ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو سمندری گھوڑے۔ ایسا کیسے ممکن ہے۔ مہا مچھلی نے حیرانی سے کہا۔ مہا مچھلی! ممکن تو یہ بھی نہ تھا کہ ایک جل پری کی شادی زمین زاد سے ہوتی۔ سمندری گھوڑے کی بات سُن کر مہا مچھلی چونک گئی۔ میں اس بد بخت کی اولاد کو کبھی جل میں رہنے کی اجازت نہ دیتی اور اسے جل بدر کر دیتی۔ جس طرح اس آدم زاد نے ہماری رانی کے ساتھ کیا ہے۔ آدم زاد ہی بے وفا ہے... تو اس کی اولاد سے کیا اُمید لگا سکتے۔

صد شکر... کہ جل پری ایسی آزمائش میں نہیں پڑی۔ ورنہ آدم زاد کی بے وفائی کے ساتھ ساتھ اسے اپنی اولاد سے جدائی کا دُکھ بھی برداشت کرنا پڑتا۔ سمندری گھوڑا در حقیقت، جل پری کی بدلتی کیفیت کے بارے میں اس وقت ہی جان گیا تھا... جب وہ اس کی آواز واپس لانے کے لیے چلہ کاٹ رہا تھا۔ وہ نہایت گہری نظر اور پرسوچ انداز سے کسی مثبت نتیجے پہ پہنچنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ مہا مچھلی کے تاثرات جان کر شدید پریشانی میں مبتلا ہوگیا تھا۔ جل پری نے ان کی تمام گفتگو من وعن سُن لی تھی اور وہ جو مہا مچھلی کو یہ کہنے آئی تھی کہ اب کی بار اس کی حکم عدولی نہیں کرے گی اور اس کی مرضی سے ہی اپنی زندگی کا فیصلہ کرے گی۔ وہ ان کی گفتگو سُن لینے کے بعد اُلٹے قدموں واپس مڑ گئی۔ اب اس کا رُخ ایک مرتبہ پھر آکٹوپس کی بھوری چٹان کی طرف تھا۔

جل پری جل محل سے لوٹتے سمے سخت پریشان تھی۔ اس کے ہراساں ہونے کی وجہ اس کے ہونے والے بچے کی زندگی تھی۔ اس کا دل و دماغ سوچ سوچ کر ماؤف ہو رہا تھا۔ مختلف حل سوچتے سوچتے اس کا دل و دماغ ایک ہی نکتے پہ مرکوز ہوگیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ بھوری چٹان کے پاس کھڑی تھی۔ آکٹوپس اسے دیکھ کر جیسے کھل اٹھا۔ وہ اس کے ساتھ اندر آگئی تھی۔ اس نے بغیر لگی لپٹی رکھے آکٹوپس سے کہا، مجھے تمہارا ساتھ ایک شرط پہ ہی منظور ہے۔ آکٹوپس جو جل پری کو اچانک وہاں دیکھ کر ہی خوش ہوگیا اس کی تو جیسے لاٹری نکل آئی۔ جل پری! مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے بچے کو جل واسیوں سے بچا لو گے۔ کسی بھی صورت اسے ان کے حوالے نہیں کرو گے۔ وہ رُک رُک کر بولی۔ ہاں جل پری میں وعدہ کرتا ہوں وہ جل پری کی بات سُن کے بے ساختہ بولا تھا۔ جل پری کو شدید دُکھ و اضطراب نے آن گھیرا... دل کہہ رہا تھا۔ کس پہ اعتبار کر رہی ہو مگر زندگی بہت ظالم ہے، بعض اوقات انسان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ دشمن پہ ہی اعتبار کرنے پہ مجبور

ہو جاتا ہے۔ جل پری کے پاس بھی اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پتا نہیں یہ محبت اس سے اور کتنے امتحان لے گی۔ پہلے آدم زاد کی محبت میں اپنا روپ بدل ڈالا اور اَب اپنی ہونے والی اولاد کی جان بخشی کے لیے اپنی زندگی داؤ پہ لگا دی تھی۔ آکٹوپس کی تو جیسے عید ہوگئی۔ وہ بولا تھا...! جل پری۔ یہ سب جل واسی میرے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔

''جل پری'' (حصّہ 20)

تم دیکھنا... کہ میں کیسے اس بھوری چٹان کو تمہارے لیے جنّت بنا دوں گا۔ یہاں پیار بھرے گیت اور رنگ برنگے جلترنگ ہوں گے۔ میں اسے برقی قمقموں سے سجا دوں گا۔ وہ جل پری کو یقین دلا رہا تھا۔ جل پری کو پیار بھرے نغموں اور برقی قمقموں سے قطعاً کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ جواب میں بولی تھی۔ بس مجھے میرے بچے کی زندگی کی ضمانت دے دو۔ آکٹوپس جو ہر حال میں اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ بولا، تمہاری اور تمہارے بچے کی زندگی اس بھوری چٹان میں محفوظ ہے۔ بس تم جل واسیوں کی باتوں میں مت آنا اور اپنا فیصلہ نہ بدلنا اور آخر کار یہی ہوا جل واسیوں کی محبت اور مہا مچھلی کی ناراضگی بھی اسے اس فیصلے سے باز نہ رکھ سکی۔ رنگیلی مچھلیوں نے اسے بہت سمجھایا اور کہا، جل پری تم مہا مچھلی کو اپنے بچے کے بارے میں بتا دو۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اسے قبول کر لے گی۔ جل پری بولی، ارے نہیں سکھیو... میں اس بابت سمندری گھوڑے اور مہا مچھلی کی گفتگو سُن چکی ہوں۔ وہ کبھی بھی ایک آدم زاد کی اولاد کو یہاں نہیں پلنے دیں گے۔ میرے پاس اپنے بچے کی زندگی بچانے کا

اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ شدت کرب سے بولی تھی۔ رنگیلی مچھلیاں دل مسوس کے رہ گئیں۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب وہ ایک بار پھر جل چھوڑ کے بھوری چٹان میں جا رہی تھی۔

اس دن پورا جل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ رنگیلی مچھلیاں اپنا رقص بھول گئیں تھیں۔ سمندری گھوڑے کے تمام جنتر منتر بے کار گئے تھے۔ مہا مچھلی کو شدید چپ نے آ گھیرا تھا۔ ایک ایسی چپ جو اگلی ساری عمر جل پری کے لبوں پہ لگ جانے والی تھی۔ وہ اپنی چہیتی اور پیاری جل پری کو دیدہ و دانستہ خودکشی کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی مگر اسے روکنے سے قاصر تھی کیوں کہ وہ اس کی ضد سے واقف تھی۔ کہ وہ کوئی بات جب ایک بار ٹھان لیتی تھی تو چاہے آسمان زمین ایک ہو جائیں۔ اس سے ٹلتی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک بار پھر اس نے دھوکا کھانا ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اب کی بار جب وہ ٹوٹے گی تو شاید دوبارہ کبھی نہیں جڑ سکے گی۔ ٹوٹنے سے جڑنے تک کے عمل میں انسان مزید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ شکست و ریخت اسے کرچی کرچی کر ڈالتی ہے۔ مہا مچھلی اور دوسرے جل واسی اس کے اس فیصلے کو اس کی ضد سمجھ رہے تھے اور صرف سمندری گھوڑے اور رنگیلی مچھلیوں کو علم تھا کہ اس نے یہ ہولناک فیصلہ کیوں کیا ہے۔

جل پری جس دن جل واسیوں کو چھوڑ کر آکٹوپس کی زندگی میں شامل ہو گئی۔ اس دن سے ہی اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ اور اسے نہیں معلوم تھا کہ آنے والا ہر نیا دن اس پہ صرف آنسوؤں کی تحریر لکھا کرے گا۔ وہ اپنا آدھا دھڑ آدم زاد کی محبت کو پانے کے لیے گنوا بیٹھی تھی اور بدلے میں نہ آدم زاد کی محبت نصیب ہوئی نہ ہی اس کا ساتھ اور ملی بھی تو آدم زاد کی کج روی، بے وفائی اور آخر کار اس کی خود غرضی کا شکار ہو کر وہ اپنا سب کچھ گنوا کے آج آکٹوپس جیسے ایک بدصورت، بدہیئت اور بدکردار کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی اور

اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی اگلی ساری زندگی ہی اس غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔ اسے وہاں رہتے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا اور اسے اندازہ ہوگیا کہ وہاں نہ تو وہ جنّت تھی نہ برقی قمقمے تھے جن کے دعوے آکٹوپس نے کیے تھے اور سب سے بڑھ کے نہ ہی وہ محبت تھی۔ ''محبت''...تو وہ احساس ہے جو خوشبو کی طرح دکھائی نہ دینے کے باوجود چاروں اطراف سے گھیرے رکھتا ہے۔ اپنے ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ جو دکھائی نہ دینے کہ باوجود چہار سو موجود رہ کر، تخیّل سے لے کر تصوّر تک اور خواب سے لے کر حقیقت تک، قدم بہ قدم ہر سانس میں محسوس ہو اور سب سے بڑھ کے محبت کا کھو جانا سوہانِ رُوح ہو لیکن اسے رفتہ رفتہ اندازہ ہوگیا کہ اس نے ایک بار پھر زندگی کا ایک غلط فیصلہ کیا ہے۔ پہلی محبت میں بھی ناحق اپنا آپ گنوا دیا اور اَب کے آکٹوپس جیسے بے مروت اور ناہنجار سے اچھائی کی اُمید لگا بیٹھی تھی جس سے سارا جل متنفر تھا اس کے بے بنیاد اور کھوکھلے دعوے پہ وہ سارا جل چھوڑ کے اس کے ہمراہ چلی آئی تھی۔ وہ آئے دن پرت در پرت اس پہ کھلتا جا رہا تھا اور وہ جان گئی تھی کہ اس کی ذات دھوکا، فریب، جھوٹ، بے ایمانی اور لالچ کا منبع ہے اور سب سے بڑھ کر اس میں منافقت کوٹ کوٹ کے بھری ہے اسے یقین ہوگیا کہ لوگ اس کے بارے میں جو بھی کہتے تھے بالکل سچ کہتے تھے۔ وہ اس قدر لالچی اور خود غرض تھا کہ اپنی ذات کے علاوہ اسے کسی دوسرے کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اسے بھوری چٹان سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ بظاہر اسے کہتا تھا کہ چوں کہ وہ ابھی پوری طرح تیرنے سے قاصر ہے اس لیے وہ اسے اکیلے باہر نہیں جانے دیتا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسے خوف تھا کہ جل پری بھی جلد ہی اسے چھوڑ دے گی کیوں کہ اس کے بدحصائل و عادات کی وجہ سے اس کے ساتھ زیادہ دن کوئی ٹکنے نہیں پاتا تھا جل پری جو قبل ازیں آدم زاد کے عطاء کیے کمرے میں بہت عرصہ تک قید تنہائی کاٹتی رہی اب بھوری چٹان اس کا مسکن بنی اور اسے نہیں معلوم تھا کہ اب اگلی ساری عمر اسے اس خوفناک بھوری چٹان میں ہی

قید رہنا ہے اور شاید یہی اس کا مدفن بنے گی۔

زندگی بہت کٹھور اور بے درد ہے۔سانس چلنے تک جیتے رہنا شرط ہے۔اندر سے مرتا ہوا انسان باہر سے ہنس بول رہا ہوتا ہے جیسے جیسے دل کا درد بڑھتا ہے قہقہے آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔کرچی کرچی ہو کر بکھر جانے والا انسان دوسروں کو اعتماد کا درس دے رہا ہوتا ہے۔محبت اور یگانگت کا پیغام رساں خود سو ٹکڑوں میں بٹا ہوتا ہے۔نہ جانے چراغ تلے ہمیشہ اندھیرا ہی کیوں رہتا ہے۔جل جل کر دوسروں کو روشنی دینے والوں کی اپنی زندگی اندھیروں میں ہی ڈوبی رہتی ہے لیکن یہ سب حساس دلوں کی سوداگری ہے من مرضی کے سودے ہیں۔دنیا کھٹور دلوں اور خود غرضوں سے بھری پڑی ہے۔ایک ذرا سا دل ہی سخت کرنا ہے نا تو زندگی سہل ہو جاتی ہے مگر نرم اور حساس دل رکھنے والے کبھی بھی آسان زندگی نہیں گزارتے اور ایک ایسی ہی اذیت بھری زندگی جل پری آکٹوپس کے سنگ گزار رہی تھی۔

''جل پری'' (حصّہ 21)

اسے اپنی پوری زندگی میں جس چیز سے سخت نفرت تھی۔اب وہ اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی اور وہ تھی بے ایمانی، جھوٹ، دھوکہ، فریب، منافقت جس کا اسے اب آئے دن سامنا کرنا پڑتا تھا وہ زندگی کا کچھ حصّہ آدم زادوں کی دنیا میں بھی گذار کر آئی تھی اور اسے اندازہ تھا کہ چور ڈاکو اور لٹیروں کا بھی کوئی نہ کوئی مذہب ضرور ہوتا ہے وہ ساری دنیا سے دھوکے کرتے ہیں لیکن کم اَز کم اپنے خاندان سے تو سچ بولتے ہیں اور مخلص ہوتے ہیں مگر اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کسی زہریلے بچھو سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔اسے اپنی طاقت اور آٹھ ہاتھوں کا بہت غرور تھا اور سچ ہی تھا کہ اس کے ہر ہاتھ تلے ایک نیا شر چھپا تھا۔وہ ہر آنے والے لمحے میں اس کی اس خصلت سے واقف ہوتی جا رہی تھی۔

وہ کئی مرتبہ جل واسیوں سے ملنے گئی تھی مگر کسی کو کچھ نہیں بتایا...رنگیلی مچھلیاں...ان برقی قمقموں کا پوچھتی رہ گئیں جن کا اس نے بھوری چٹان سے ایک مرتبہ واپس آنے کے بعد بتایا تھا۔وہ اس سے ہنس بول رہی تھیں مگر اس کے لب ایک بار پھر سے ہنسنا بھول چکے تھے۔وہ مہا مچھلی کی کھوجتی نگاہوں سے بہت پریشان ہو رہی تھی...جو پوری طرح اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔وہ مہا مچھلی کو دکھانے کے لیے زور زور سے قہقہے لگانے لگی مگر

اس کی وہ ہنسی جس میں کسی وقت مدھر جلترنگ بجتی محسوس ہوتی تھی۔آج ایسا لگ رہا تھا کہ سیکڑوں کانچ تھے جو ایک چھناکے سے سارے کے سارے ٹوٹ چکے تھے۔ مہا مچھلی نہایت خوفزدہ ہوگئی تھی...ایسی ہنسی سے تو چپ ہی بھلی تھی۔اس کے ٹوٹے کانچ جیسے قہقہے اس کو شدید تکلیف دے رہے تھے۔اس نے اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ہلکورے لیتے درد کی لہروں کو چھپانے کے لیے اس نے نظریں چرالیں۔وہ سارے جل کو اُداس کر کے وہاں سے چلی آئی تھی۔

وقت سرکتا جار ہا تھا۔ہر آنے والا دن اسے دیوار کے ساتھ لگا تا جار ہا تھا۔اسے محبت تو اس سے پہلے ہی نہیں تھی مگر اب وہ آکٹوپس سے شدید نفرت کرتی تھی۔وہ ایک بدنما اور غلیظ دل رکھتا تھا۔اس نے پہلے بھی کئی رنگیلی مچھلیوں کو کھایا تھا اور اَب بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ باہر جا کر رنگیلی مچھلیوں کے ٹولے کو اپنے ساتھ لایا کرے اب اسے سمجھ آئی تھی کہ سارا جل کیوں اسے بُرا بھلا کہتا تھا۔اس نے جل پری کی زندگی اجیرن کردی تھی۔وہ ایک طرح سے اس کی قید میں تھی۔وہ جب بھی رنگیلی مچھلیوں سے ملتی،وہ اسے پاؤں لہرا کر تیرنے کی مشقیں کرواتی لیکن آکٹوپس اس بات سے پوری طرح لاعلم تھا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ جل پری اپنے آپ تیر سکے۔وہ اسے ہمیشہ کے لیے اپاہج رکھنا چاہتا تھا تا کہ وہ ساری عمر اس کے تسلّط سے باہر نہ آسکے کیوں کہ اسے علم تھا کہ جوں ہی جل پری نے دوبارہ تیرنا سیکھ لیا وہ ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ جائے گی۔وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس نے زبردستی جل پری کو اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے لیکن اَنا،خودغرضی،منافقت اور ہٹ دھرمی کے بت کو توڑنا اپنے آپ کو گرانے کے مترادف تھا۔

آج پھر وہ رنگیلی مچھلیوں کے ساتھ اپنی پرانی جگہ پر آئی تھی۔وہ سب اسے ہنسنے بولنے پہ اُکسا رہی تھیں۔اسے اپنے کھیل تماشے میں شامل کر رہی تھیں مگر اس کے لب ہنسنا بھول چکے تھے۔اسے خود سے زیادہ ان رنگیلی مچھلیوں پہ ترس آرہا تھا جو اسے خوش کرنے کی کوشش

میں رقص کر کر کے ہانپ رہی تھیں۔اس نے زبردستی قہقہہ لگانے کی کوشش کی۔اس کا سارا بدن لرز رہا تھا۔اسے کہیں سے آدم زاد کی آواز سنائی دے رہی تھی ساتھ ہی بہت گندی سی بدبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی...وہ ان ہڈیوں اور گوشت کے گلنے سڑنے کی تھی جو آکٹوپس سے ہر وقت آتی رہتی تھی۔قہقہہ لبوں پہ آنے سے قبل ہی دم توڑ چکا تھا۔دل میں بے طرح درد جاگ اُٹھا...اس پہ قابو پاتے پاتے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ نکلیں۔وہ زورزور سے ہانپ رہی تھی۔رنگیلی مچھلیاں اپنا کھیل بھول کر اَب اسے سنبھال رہی تھیں۔

وہ پچھلے کچھ دن سے ہی رنگیلی مچھلیوں کی ہمراہی میں وقت گزار رہی تھی اور یہ موقع اسے قدرت نے خود ہی فراہم کر دیا کہ آکٹوپس کو دراصل کچھ دن پہلے کسی بحری جہاز کے سمندر میں لنگر انداز ہونے کی اطلاع ملی تھی اور وہ روزانہ وہاں جا کے اپنا شکار ڈھونڈتا تھا۔وہ جہاز شاید خراب تھا جس پہ بہت سے انسان بھی پھنسے تھے اور ان کو ابھی تک وہاں سے بحفاظت نکالنے کا انتظام نہیں ہوسکا تھا۔خبر مہا مچھلی کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔جل کے اُصول سب کو اچھی طرح معلوم تھے۔وہ کبھی بھی کسی مجبور و بے کس کو شکار نہیں کرتے تھے بلکہ جہاں تک ہوتا، پس پشت رہ کر ان کی مدد کی جاتی۔وہ رنگیلی مچھلیوں کو بتا رہی تھی کہ آکٹوپس روزانہ کہاں جاتا ہے۔پچھلے کچھ دن سے وہ ادھ کھائے انسان وہاں بھوری چٹان میں لے کر آیا کرتا تھا اور اس گندگی اور تعفن سے بچنے کے لیے جل پری اس کے جاتے ہی بھوری چٹان سے نکل کر رنگیلی مچھلیوں کی سنگت میں آجاتی تھی۔اب وہ ٹانگوں اور پیروں کی حرکت سے آہستہ آہستہ تیر سکتی تھی۔گو کہ وہ پُرانی والی طاقت و توانائی تو واپس نہ آسکی تھی۔

رنگیلی مچھلیاں اس کی حالت کے پیشِ نظر خاموشی سے اسے گھیرے میں لے کر بیٹھ گئیں۔اس کا لرزتا کانپتا بدن اب ساکت ہو چکا تھا۔وہ ہنسنے کی کوشش ترک کر کے رنگیلی مچھلیوں سے مخاطب ہوئی۔آکٹوپس نہایت ہی غلیظ ہے۔ابھی بھی وہ وہی کام کرتا ہے جن کی

وجہ سے اسے مہا مچھلی نے جل سے نکالا تھا اور رنگیلی مچھلیاں کپکپا کر رہ گئیں جب انھیں پتا چلا کہ وہ اُوپر پھنسے بحری جہاز سے انسانوں کو شکار کر کے بھوری چٹان میں لاتا ہے۔ زیادہ تر اس کے زہریلے پنجوں کے خوف سے پہلے سے مر چکے ہوتے ہیں... کچھ میں زندگی کی رمق باقی ہوتی تھی اور پانی کی تہہ میں پہنچتے ہی مر جاتے تھے۔ وہ رنگیلی مچھلیوں کو سب کچھ بتاتے بتاتے ہانپ رہی تھی۔ رنگیلی مچھلیاں تو اس سے پہلے سے ہی متنفر تھیں۔ وہ سب اس کا دل بہلانے لگیں۔ وہ اپنی پیاری سہیلی کے درد میں اس کے ساتھ شریک تھیں اور اس کی جسمانی حالت سے بھی واقف تھیں۔ وہ اسے دلاسہ دے رہی تھیں۔ ان میں سے چلبلی مچھلی بولی! جل پری تمہیں اپنے اور آکٹوپس کے متعلق مہا مچھلی کو سب بتا دینا چاہیے۔

قرمزی مچھلی نے کہا! مجھے یقین ہے کہ جب مہا مچھلی کو جل پری کے بچے کا پتا چلے گا تو وہ سب بھول جائے گی اور جل پری اور اس کے بچے کو ایک مرتبہ پھر سے گلے لگا لے گی مگر جل پری بولی، نہیں نہیں... میں مہا مچھلی کو مزید کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ بس جو مجھے مل رہا وہ میری قسمت ہے لیکن میں اپنے ہونے والے بچے کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔ سمجھانے بجھانے کی تمام کوششیں ناکام ہوتے دیکھ کر رنگیلی مچھلیوں نے ایک بار پھر ملنے کا وعدہ کر کے واپس جل جانے کا ارادہ کیا اور حسبِ معمول اسے بھوری چٹان کے قریب تک چھوڑنے گئیں۔ آج وہ معمول سے کچھ زیادہ ہی وقت رنگیلی مچھلیوں کے ساتھ رہی تھی اور خوفزدہ تھی کہ کہیں آکٹوپس واپس نہ آ گیا ہو...

''جل پری'' (حصّہ 22)

اسے ہر صورت آکٹوپس کے آنے سے قبل بھوری چٹان میں واپس جانا تھا...وہ کئی روز سے اس کی واپسی پہ اس کے پنجوں میں جکڑے ادھ کھائے انسان دیکھ رہی تھی...اور...اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے آگے کیا کچھ دیکھنا ہوگا جو شاید اس کے حواس ہی معطل کر دے گا۔ وہ رنگیلی مچھلیوں کو الوداع کہہ کر بھوری چٹان کی طرف جا رہی تھی... چلبلی مچھلی اسے یہاں چھوڑنے آئی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کے واپس پلٹی اور جل پری نے جیسے ہی اندر قدم رکھا سمندری کتے نے اسے اطلاع دی کہ آکٹوپس آج اس سے پہلے آ گیا تھا اور ایک انسان کو ادھ کھایا یہاں چھوڑ کے واپس بحری جہاز کی طرف چلا گیا تھا کیوں کہ آج بحری جہاز میں پھنسے لوگ ایک ایک کر کے نکالے جا رہے تھے اور ان کو واپس بھجوایا جا رہا تھا اور آکٹوپس کی لالچ کی انتہا کہ وہ جلدی جلدی شکار کر کے لاتا جا رہا تھا اور پھر اُوپر چلا جاتا... ایسے میں اسے جل پری بھول چکی تھی۔ بھول تو جل پری آدم زادے کو بھی چکی تھی۔ جس سے بچھڑتے سمے خیال تک نہ تھا کہ زندگی میں دوبارہ کبھی اس سے مُلاقات ہو سکتی ہے۔ جوں ہی وہ بھوری چٹان میں داخل ہوئی سامنے ہی پڑے بے سدھ کسی وجود نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔ وہ منہ کے بَل اُلٹا لیٹا تھا اور کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ مر گیا یا زندہ

ہے۔ کچھ عجیب سی کشش اسے اس سمت کھینچتی چلی جارہی تھی۔سمندری کتے نے بتایا کہ اسے ابھی ابھی یہاں چھوڑ کر آکٹوپس اُوپر مزید شکار لانے گیا ہے۔اس سے صبر نہ ہوا اور اسے سیدھا کیا تو اب وہ اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہی تھی۔محبت کی خوشبو میلوں دُور سے محسوس کی جاسکتی ہے...وہ ضرار تھا...وہ خود غرض اور بے وفا آدم زاد جس کی بے وفائی نے اس کی رُوح تک کو چھلنی کر دیا تھا۔اس کی ایک ٹانگ گھٹنے سے نیچے تک زخمی تھی کیوں کہ آکٹوپس انسانوں کو لاچار بنا کے پہلے یہاں ڈال دیتا تھا کہ وہ مزاحمت نہ کرسکیں یا بھاگنے کی کوشش نہ کریں اور پھر پانی میں چند منٹ ہی ڈوبے رہنے سے موت تو واقع ہو ہی جاتی تھی لیکن آدم زاد میں زندگی کی آخری رمق باقی تھی شاید وہ درد اور تکلیف کی شدت سے بے ہوش تھا اور اگر کچھ لمحے بھی مزید پانی میں رہتا تو اس نے مرجانا تھا...جل پری کے پاس سوچنے کو کچھ لمحے ہی تھے...ابھی چلبلی مچھلی بھی زیادہ دُور نہیں گئی ہو گی۔وہ اپنی پوری قوت لگا کے آدم زاد کو گھسیٹتی ہوئی بھوری چٹان سے باہر لارہی تھی۔اس کا اپنا سانس پھول رہا تھا۔وہ تو خود بمشکل تیر سکتی تھی اور اَب ایک بھاری بھرکم وجود کے ہمراہ وہ نڈھال ہو چکی تھی اور قریب تھا کہ وہ خود بھی اوسان خطا کر بیٹھتی کہ اس کی مخصوص سی آواز جو وہ رنگیلی مچھلیوں کو بلانے کے لیے نکالتی تھی۔وہ نہ صرف چلبلی مچھلی بلکہ تمام رنگیلی مچھلیوں کو سنائی دی اور وہ سب آندھی وطوفان کی مانند اس تک پہنچ چکی تھیں۔اسے ایک آدم زاد کو اپنے ساتھ گھسیٹتے دیکھ کر ششدر تھیں۔اس کے پاس کچھ بتانے کو وقت نہیں تھا۔وہ اس کے کہنے پہ اسے اور آدم زاد کو اُٹھا کر روئی کے گالے کی طرح سطح سمندر پہ لے آئیں۔جل پری آدم زاد کو گھسیٹتی ہوئی ساحل سمندر پہ لارہی تھی۔ رنگیلی مچھلیاں پانی میں سے باہر جھانک رہی تھیں...کسی کو کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔وہ سب جل پری کی آنکھوں میں آدم زاد کا عکس دیکھ چکی تھیں اور یوں بھی گم شدہ محبت کی قبر دل میں اور عکس آنکھوں میں تاعمر دفن رہتا ہے۔

جل پری آدم زاد سے بچھڑنے کے بعد پہلی مرتبہ ساحل سمندر کے پاس آئی تھی۔ وہ کبھی ساحل کی طرف جانے کا سوچتی بھی نہیں تھی۔ اسے ساحل کے قریب بھی جاتے ہوئے خوف آتا تھا۔ وہ اس دنیا کو دوبارہ مڑ کر کبھی دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی مگر قسمت نے آج اسے پھر اسی پتّھر کے کنارے لاکھڑا کیا جہاں وہ بے وفا اسے آخری بار چھوڑ گیا تھا اور آج وہ اسی پتّھر کے کنارے اسے چھوڑنے آئی تھی مگر یہ اس کی وفا تھی! جو اس کی زندگی بچانے پر مجبور کر رہی تھی۔ اسے پیٹ کے بل لٹا کر پہلے اس کے پھیپھڑوں سے پانی نکالنے کی کوشش کی وہ مدھم مدھم سی سانس لے رہا تھا۔ اگر ذرا سی دیر مزید ہو جاتی تو اس کا بچنا ناممکن تھا۔ ابھی بھی اس کا زندگی کی طرف لوٹنا ایک معجزہ ہی تھا کیوں کہ اس کی ایک ٹانگ کافی زخمی ہو چکی تھی اور زہر سارے بدن میں سرایت کر سکتا تھا مگر بھلا ہو سمندری گھوڑے کا جس کی منتری جڑی بوٹیوں نے ایک ہی پل میں سارا زہر نکال باہر کیا اور اس کے زخموں کے لیے تریاق کا کام کیا۔ وہی جل پری جس نے اس کی محبت میں اپنے جنموں سے دان کیے روپ کو بدلا تھا اور بدلے میں اسے آدم زاد کی بے وفائی اور خود غرضی ملی تھی اور آج اسی جل پری نے اس کو موت کے بھیانک پنجوں سے بچا لیا تھا مگر دنیا مکافاتِ عمل ہے تو قدرت نے اس کا انتقام خود لیا تھا وہ ایک ٹانگ سے معذور ہو چکا تھا اور اَب اگلی ساری عمر اسے اسی معذوری اور پچھتاوے کے ساتھ زندہ رہنا تھا۔

ضرار ہوش میں آ چکا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ وہ خالی خالی نظروں سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ پہلے اسے لگا کہ وہ مر چکا ہے مگر پھر کچھ دُور لوگوں کے گروہ دیکھ کے سمجھ گیا، کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ اسے عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا۔ کچھ دن پہلے ہونے والے بحری جہاز کا اچانک حادثہ اور پھر لاشعور سے جھانکتے ماضی کے واقعات... جل پری... اور اس سے جڑی گم گشتہ محبت کی یادیں جو اس کی اپنی ہی زیادتی کا شاخسانہ

تھیں۔اس نے بے تابی سے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ کچھ عجیب سا درد جاگ اُٹھا تھا دل میں۔پھر اس کی نظر اس بڑے پتّھر پہ جا کے ٹھہر گئی۔ یہ تو وہی پتّھر تھا۔جہاں وہ اور جل پری ملا کرتے تھے۔بے چینی و بے قراری سے اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا وہ بے اختیار ہو کر پتّھر کی سمت لپکا کاش اے کاش کہ اس کی جل پری جس نے اس کی خاطر اپنا جنم دان کیا گیا روپ بھی بدل لیا تھا اور سب کچھ چھوڑ کر اس کے ساتھ اس کی دنیا میں چلی آئی تھی اور وہ ایک آدم زاد جو انتہائی خود غرض اور کٹھور نکلا کہ اسے بے یارو مدد گار اسی پتّھر کنارے چھوڑ کر اپنی دنیا میں چلا آیا یہ سوچے سمجھے بغیر کہ وہ تو اس کی خاطر اپنا روپ بھی بدل چکی ہے اور یہ دیکھے بغیر کہ جل اسے دوبارہ قبولے گا بھی کہ نہیں۔اسے لگتا تھا کہ اس کا دم گھٹ جائے گا اس نے چلنا چاہا مگر لڑکھڑا کر گر پڑا اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ تو اپنی ایک ٹانگ بھی کھو چکا ہے کچھ لوگوں نے اسے دیکھ لیا تھا وہ اس کی طرف آرہے تھے۔وہ بے اختیار اس پتّھر کے گرد اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے کچھ ڈھونڈ رہا تھا مگر وہ تو جا چکی تھی۔جسے وہ ڈھونڈ رہا تھا۔وہ کہیں نہیں تھی۔وہ دیوانہ وار اسے آوازیں دے رہا تھا۔اسے اس وقت اپنی ٹانگ کے کٹ جانے کا بھی اتنا غم نہیں تھا جتنا کہ جل پری کے نہ ملنے کا،ارد گرد کھڑے لوگ اسے دیوانہ سمجھ رہے تھے۔اسے وہ لمحہ یاد کر کے کپکپی آگئی جب وہ بحری جہاز کسی خرابی کی وجہ سے سمندر میں ایک بہت بڑی بھوری چٹان کے قریب جا کے رک گیا تھا۔وہ بھی اسی جوش و جذبے کے تحت اس جہاز پہ سوار ہوا تھا کہ یہ جہاز چوں کہ سمندر میں بہت آگے تک جائے گا۔

’’جل پری‘‘ (حصّہ 23)

وہ اسی اُمید پہ اس بحری سفر پر روانہ ہوا کہ شاید کہیں جل پری کا سراغ مل جائے۔ جب بحری جہاز خرابی کے باعث بھوری چٹان کے پاس رک گیا تو اسے عجیب سا احساس ہوا کہ جیسے جل پری یہیں کہیں قریب ہی ہو۔ ان کے کچھ ساتھی بحری جہاز سے لاپتا ہو چکے تھے اور یہ ایک الگ معمہ تھا۔ سب اس صورتِ حال سے بے حد خوفزدہ تھے۔ پھر کسی نے ایک بہت بڑے آٹھ پنجوں والے آکٹوپس کو ان کے ایک ساتھی کو کھینچ کے لے جاتے ہوئے دیکھا۔ اب صورتِ حال واضح ہو چکی تھی... سخت چیخ و پکار شروع ہو گئی۔

ان کے ساتھی دوسرے بحری جہاز میں سوار ہو کر ان سب پھنسے ہوئے لوگوں کو بچانے آ رہے تھے اور جب ان کو حالات کی سنگینی کا پتا چلا تو وہ بھاری اسلحہ سے لیس ان کی طرف آ رہے تھے مگر ہونی کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ تمام لوگ آکٹوپس سے خوفزدہ ہو کر اندر چھپے بیٹھے تھے اور باہر آنے سے گریز کر رہے تھے مگر وہ جس مقصد کے لیے آیا تھا اسے ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ اچک اچک کے پانی کے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی عفریت نے اسے اپنے خوفناک پنجوں میں دبوچ لیا (اور اسے کیا معلوم تھا کہ اسی درندے کے ساتھ جل پری ایک مدت سے ایسے زندگی گزار رہی ہے کہ نہ زندوں میں ہے نہ مردوں میں) پھر اسے اپنی داہنی ٹانگ پہ شدید درد کا احساس ہوا جیسے کسی نے کند چھری سے

ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہوں۔

اسے اپنا وجود تاریکیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر وہ بس خواب ہی دیکھتا رہا کہ اس کا سانس بند ہو گیا ہے اور وہ پانی میں گر گیا ہے۔ پھر جل پری اسے اُٹھا لیتی ہے اور وہ نیلے پانیوں کی گہرائیوں میں جل پری کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ یہ اگر خواب تھا تو بے حد حسین بہت ہی انوکھا پھر اسے کچھ یاد نہ تھا آنکھ کھلی تو خود کو اسی پتّھر کے کنارے پڑا دیکھا۔ جہاں وہ اور جل پری پہلی بار ملے تھے۔ وہ جل پری کا وجود وہاں محسوس کر رہا تھا پھر جل پری کا وہاں موجود نہ ہونا... اس کی ایک ٹانگ کے نہ ہونے سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح چیخیں لگا رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک دھڑک کے اسے یقین دلا رہا تھا کہ جل پری یہاں آئی تھی۔ وہ اپنے چہرے پر اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر رہا تھا، پتّھر کے گرد زمین پر ایک ٹانگ سے خود کو گھسیٹتے ہوئے وہ اسے آوازیں دے رہا تھا۔ اس کا روم روم چلا رہا تھا کہ صرف ایک بار وہ اسے نظر آجائے اسے پتا چل جائے کہ وہ یہاں آئی تھی پھر یکبارگی اس کا ہاتھ کسی مانوس سی چیز سے ٹکرایا۔ وہ ٹھٹھک کر رُک گیا اس کے بٹن کے ساتھ کوئی چیز اٹکی تھی۔ وہ سبز و سنہری مور پنکھ تھا جو اس کے ماتھے میں کنداں تھا اس کی چیخیں رُک گئیں۔ دھڑکتے دل کو قرار آ گیا۔ وہ اسے بار بار عقیدت سے چوم رہا تھا۔ اسے آنکھوں سے لگا رہا تھا۔ اب اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ لوگ اسے ایک گاڑی میں ڈال کے لے جا رہے تھے۔ وہ اس پنکھ کو نہایت مضبوطی سے تھامے بیٹھا تھا اور لوگوں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کوئی دیوانہ ہے۔ ایسا دیوانہ جس سے اگر یہ پنکھ چھین لیا جائے تو شاید جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

جل پری سمندری گھوڑے کی منتری جڑی بوٹیاں آدم زاد کے زخموں پر لیپ لگانے کے بعد اس کی دھڑکن بحال ہوتے دیکھ کر آسودہ ہو گئی۔ اس کے زرد چہرے پہ نظر پڑتے ہی بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آ گئیں مگر دوسرے ہی پل اپنی قربانیاں اور اس کی زیادتیاں چشم زدن سے آنکھوں کے سامنے آن کھڑی ہوئیں وہ اس پر سے نظریں ہٹا کر

بے دردی سے آگے بڑھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ یکبارگی پلٹ گئی... آہستہ آہستہ اس کے قریب آ کر رُک گئی اپنے ماتھے کی طرف ہاتھ لے کر گئی۔ پھر کسی سوچ میں پڑ گئی۔

ماضی کے جھروکوں سے وہ شام جھانک رہی تھی جب چاندنی رات میں سمندر کنارے اسی پتّھر پہ بیٹھے پیار کی مالا جھپ رہے تھے... جب آدم زاد نے اس کے ماتھے پر لگے دو خوب صورت و دلکش سبز و سنہری مور پنکھ دیکھ کے کہا تھا کہ تم مورنی ہو یا جل پری... وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی... یہ جو دو پر ہیں نا یہ ہمیں پانی سے باہر آنے کے بعد سورج کی کرنوں کے ذریعے زمین پہ چلنے کی قوت دیتے ہیں... ان کے ٹوٹ جانے سے ہماری قوت بالکل ختم تو نہیں ہوتی مگر بہت کم ہو جاتی ہے اور... اگر ایک پر ٹوٹ جائے تو آدم زاد نے پوچھا تھا۔ پھر تھوڑی دیر ہی زمین پہ چلنے کے بعد ہمیں ہر صورت پانی میں اُترنا ہو گا اور ہم زمین پہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکیں گے۔ وہ معصومیت سے اسے اپنے آپ سے جڑے سب راز کسی دیرینہ دوست کی طرح دیتی رہی اور اگر یہ دونوں پر ٹوٹ جائیں تو کیا ہو گا جل پری خوفزدہ ہو گئی بس پھر مجھے ہمیشہ کے لیے پانی میں ہی رہنا ہو گا اور میں زمین پہ دوبارہ کبھی واپس نہیں آسکوں گی۔ اس لمحے تو آدم زاد بھی ڈر گیا تھا اور اسے ان پروں کا از حد خیال رکھنے کو کہا تھا اور بعد میں جب آدم زادے کو پچھتاوں نے گھیر لیا اور اس نے جل پری سے اُکتا کر اسے جل میں ہی واپس چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ جل پری بھلا وہ دن کیسے بھول سکتی تھی جب آدم زاد اسے ساحل کنارے چھوڑنے کے بعد جانے سے پہلے، بے دردی اور بے رحمی سے اس کے ماتھے پہ لگے پیدائشی مور پنکھ نوچ رہا تھا۔ گھبراہٹ سے اس کے ہاتھ میں صرف ایک ہی پنکھ آیا... دوسرا اس کے ماتھے پہ ہی ثبت رہ گیا اور یوں وہ اکلوتا مور پنکھ بے وفائی کا نشان بن کے ہمیشہ کے لیے اس کے ماتھے پہ ثبت رہ گیا تھا۔

بے وفائی اپنی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ وہ صدمے سے گنگ رہ گئی۔ اس کی جدائی، اس کا اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ جانا اور اس کے مور پنکھ جو اس کی شان... اس کی قوت

تھے ان کا نوچ لینا اور وجہ جاننے کی اسے ضرورت نہ تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی بھی صورت اس کی تلاش میں دوبارہ اس کی دنیا میں آسکے۔ درد اور اذیت اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ وہ اب کبھی کسی پہ اعتبار نہیں کرے گی۔ اس کے سارے وجود میں بے اعتباری کا زہر بھر گیا۔ محبت کے نام پہ کیا گیا دھوکا اسے زندہ درگور کر گیا تھا۔ انسانوں کی دنیا بے حد بدصورت تھی اور انسان خود بھی۔ اگر اسے قدرت نئے مور پنکھ بھی عطاء کر دے تو وہ کبھی اس زہریلی دنیا میں واپس نہیں جائے گی۔ اس نے خود سے جو نہ توڑنے والا عہد کیا تھا وہ اس پہ تاعمر قائم رہے گی۔ تب ہی زہریلے آکٹوپس کا زہر اسے انسان کے زہر سے کم لگتا تھا۔

وہ اپنے خیالوں سے باہر آ گئی تھی۔ اس نے جانے سے قبل اپنا دوسرا اور آخری مور پنکھ خود اپنے ہاتھوں سے توڑا اور آہستگی کے ساتھ آدم زاد کے بٹن کے ساتھ لگا دیا۔ کسی زمانے میں ایک پنکھ اس نے توڑا تھا کہ وہ اس کی تلاش میں زمین پہ نہ آسکے اور آج دوسرا پنکھ اس نے خود توڑ دیا تاکہ وہ کبھی زمین اور زمین پہ موجود زمین زادوں کی شکل بھی نہ دیکھ سکے۔ زمین پہ تھوڑی دیر مزید رُکنے سے اس کی سانسیں اُکھڑنے لگی تھیں کیوں کہ دونوں مور پنکھ ٹوٹ چکے تھے۔ اب وہ کبھی زمین پہ سانس نہیں لے پائے گی۔ نہ ہی زمین پہ آسکے گی۔ یہی تو آدم زاد چاہتا تھا۔ اذیت اب بھی ویسی تھی۔ بے چینی ابھی بھی عروج پہ تھی بس اب اس کی جگہ ٹھہراؤ نے لے لی تھی۔ وہ پھر رُکی نہیں۔ پتا نہیں اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ وہ تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی سمندر کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے ایک نظر بھی مڑ کر اس بے سدھ پڑے وجود کو نہ دیکھا جس کے دم سے کبھی اس کی سانسیں چلتی تھیں۔ وہ ایک بار پھر سمندر میں اتر گئی ہمیشہ کے لیے، کبھی واپس نہ آنے کے لیے اور اسی زہریلے آکٹوپس کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے... مگر ہمیشہ کچھ بھی نہیں رہتا یہاں تک کہ ظلم اور جبر کا تسلّط بھی... جب وہ حد سے گزر جاتا ہے اور صبر اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو رحمت خداوندی جوش میں

آجاتی ہے۔ پھر ظلم کو مٹ جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

لالچ، طاقت اور غرور کا نشہ کسی کو بھی وقتی فائدہ شہرت اور آسانی ضرور فراہم کر دیتا ہے مگر جبر سے خریدی گئی۔ خواہ وہ محبت ہو حکومت ہو یا دولت اسے دوام حاصل نہیں ہوتا۔ وہ جلد یا بدیر ضرور مٹّی میں مل جاتی ہے۔ آکٹوپس، جو اپنے لالچ اور عناد سے اس قدر طاقت ور بن گیا تھا کہ قدرت کی طرف سے اُگنے والے خود رو شجر لحم کی فراہمی کے باوجود اپنی طاقت کے نشے میں چور معصوم اور لاچار مخلوق کو نقصان پہنچانے سے گریز نہ کرتا اور سب سے بڑھ کے اس نے جل پری کو پیار محبت کا جھانسا دے کر اپنی قید اور غلامی میں عرصہ دراز سے اس کی مرضی کے خلاف قید رکھا ہوا تھا مگر کسی کی خاموشی بھی بعض اوقات بد دعا بن جاتی ہے اور ہر چیز کا ایک وقت مقرر رہے۔ وقتی ناکامی انسان کو مایوسی سے ضرور دو چار کر دیتی ہے لیکن یقین کامل ہونا چاہیے کہ غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے اور فتح ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے اور یہی انجام اس گھمنڈی آکٹوپس کا ہوا کہ جب وہ ایک ایک کر کے بندے بحری جہاز سے لے کر جا رہا تھا تو وہ جھٹ سے لوگوں کی نظروں میں آ گیا اور پھر ریسکیو کے لیے آنے والے دوسرے بحری جہاز سے باقاعدہ پلاننگ کے تحت اس پر اس وقت گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ جب وہ کسی بندے کو گھسیٹ کے لے جا رہا تھا اور وار ایسا نشانے پہ بیٹھا کہ اس کے پرخچے اُڑ گئے اور یوں اپنی طاقت اور قوت کے نشے میں چور وہ گھمنڈی آکٹوپس اپنے انجام کو پہنچا۔ اس کے فنا ہوتے ہی بھوری چٹان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور یوں ظلم و جبر کا یہ باب تمام ہوا۔

''جل پری'' حصّہ 24 (آخری حصّہ)

بحری جہاز واپس لے جایا جا چکا تھا اور اس کے ساتھ ضرار کو بھی جو لوگ اُٹھا کے لے گئے تھے انھوں نے اس کے والد کو اطلاع کر دی۔ یوں اسے شہر کے سب سے بڑے ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ جہاں بہت عرصہ تک اس کی زخمی ٹانگ کا علاج ہوتا رہا مگر وہ گھٹنے تک کاٹنی پڑی ورنہ زہر سارے جسم میں سرایت کر جاتا اور اس کی زندگی بچانی مشکل ہو جاتی۔ ہسپتال سے اسے اُٹھا کے گھر لایا گیا۔ الوینہ تو پہلے ہی اس کی زندگی سے جا چکی تھی اب آنٹی دُردانہ کے لیے وہ فقط زحمت تھا کیوں کہ ان دونوں نے اپنے پلان کے مطابق اس سے جو فائدہ لینا تھا لے لیا تھا۔

اس واقعے کے بعد تو اس کی ذہنی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو چکی تھی۔ وہ اچانک ہی ہوش و حواس سے بے گانہ ہو جاتا اور کئی کئی دن ہوش میں نہ آتا۔ ہشام صاحب نے اپنی ساری مصروفیات ترک کر کے اس پہ توجہ دینی شروع کی لیکن لگتا تھا کہ اب اسے اس توجہ اور محبت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ بیساکھیوں کے سہارے چلنا شروع

کر دیا۔ کبھی کبھی وہ خود کلامی کرنے لگتا تھا اور کبھی ہفتوں بیت جاتے اسے کوئی بات کیے۔ ہشام صاحب نے اسے اس کے کچھ دوستوں کے کہنے پہ جھل مگسی کے اسی ریسٹ ہاؤس کی ریزیڈنسی میں شفٹ کر دیا، جہاں سے اس کی زندگی کو یہ روگ لگا تھا کیوں کہ وہ اپنے اثر رسوخ سے یہ کھوج لگا چکے تھے کہ جو بھی ہوا اسی جگہ سے اس کا گہرا تعلق ہے اور یوں بھی گمشدہ چیزیں عموماً وہیں سے ملتی ہیں۔ جہاں کھوئی ہوتی ہیں۔ اس کی حالت تھوڑی سنبھلی تو وہ اسے وہاں چھوڑ کے واپس لوٹ گئے۔ جل پری کے ماتھے کا پر وہاں موجود لوگوں نے ہار کی طرح اس کے گلے میں ڈال دیا اور وہ اسی حال میں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا۔ وہاں موجود عملہ اس کی دیکھ بھال کرتا رہتا اور ہشام صاحب کو اس کے بارے میں مکمل آگاہی بھی دیتا تھا لیکن رفتہ رفتہ ہر ایک نے اسے اس کے حال پہ ہی چھوڑ دیا۔ وہ بعض اوقات کئی کئی دن پاگلوں جیسے حلیے میں پھرتا تھا اور اسی پتّھر کنارے آ کے پہروں بیٹھا رہتا۔ جب تک کوئی اسے وہاں سے اُٹھا نہ لیتا۔ رفتہ رفتہ اس کی کہانی سارے جھل مگسی میں مشہور ہو گئی اور وہ پتّھر جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا۔ وہ ساحل ''جھل پری'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے تو یہ تک کہہ دیا کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے اس پتّھر کنارے جل پری کو پانی سے نکلتے اور پھر اندر جاتے دیکھا ہے۔

آکٹوپس اور بھوری چٹان کا قصّہ تمام ہوتے ہی جیسے پورے جل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تمام جل واسی اس کے ظلم و جبر اور قتل و غارت سے عاجز آنے کے علاوہ اس بات سے بھی اس سے متنفر تھے کہ اس نے ان کی چہیتی جل کی رانی کو زور زبردستی سے بھوری چٹان میں قید رکھا ہوا تھا۔ اب جل پری کی واپسی ان سب کے لیے... خاص طور پہ مہا مچھلی کے لیے بہت خوش آئند بات تھی... جل پری آکٹوپس کے مرتے ہی جل محل میں واپس آ گئی تھی اور وہ دن بہت خوش کن تھا جب رنگیلی مچھلیوں اور سمندری گھوڑے کے پاس رہ کر جل پری نے ایک بہت خوب صورت بچے کو جنم دیا تھا اور اس سے بھی بڑھ کے حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ

وہ ایک جل مانس تھا۔جب اسے جل پری کے سامنے لایا گیا تو وہ اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی کیوں کہ وہ تھا تو ایک جل مانس...لیکن اس کی شکل بالکل ضرار جیسی تھی۔قدرت نے کتنا خوب صورت تحفہ دیا تھا اسے کہ اگر وہ ایک انسان ہوتا تو بہر صورت جل بدری ہی اس کا مقدر بنتی لیکن اللہ نے اس کے سارے دُکھوں کا مداوا کر دیا تھا۔جل پری کی جل محل واپسی کے بعد بہت سے جل واسیوں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا...جن میں کچھ تو دوسرے جل سے آئے ہوئے جل مانس بھی تھے...لیکن مہا مچھلی کے پرزور اصرار کے باوجود اس نے سب کو انکار کر دیا۔

اس نے ایک آدم زاد کی محبت کو آزما کر سب کچھ کھو دیا تھا...حتیٰ کہ اپنا آپ...اپنی پہچان...اور کسی پہ کیا جانے والا اعتماد اور یقین بھی...جس نے اسے آکٹوپس جیسے خونخوار اور وحشی درندے کے چنگل میں لا پھنسایا۔زندگی میں ہونے والی اس ٹوٹ پھوٹ نے اسے توڑنے کے بجائے بہت مضبوط بنا دیا تھا اور اَب اس نے بنا کسی سہارے اور رشتے کے زندگی کا سفر طے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اپنے اس فیصلے پہ بہت مطمئن تھی۔مہا مچھلی اس کے اعتماد پر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پر یقین بھی تھی کہ اب اسے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔جل پری کے دل میں...نہ کسی کی محبت باقی رہی نہ ہی کھو جانے والی محبت کا دُکھ...اب وہ ساری عمر کسی پہ اعتبار نہیں کرے گی اور رنگیلی مچھلیوں کے ساتھ جل کی رانی بن کے رہے گی اور یوں بھی اب اسے پانی پہ چلنا آگیا تھا اور اپنے زور بازو پہ...پانی پہ چلنے والے کبھی گرتے نہیں ہیں...سہارے انسان کو کمزور بنا دیتے ہیں اور اکیلے چلنے والے محض اپنے بَل پہ آگے بڑھتے ہیں تو راستے میں لگنے والی ٹھوکر ان کے راستے میں رکاوٹ بننے کے بجائے ان کی رفتار کو مہمیز کرتی ہے۔مہا مچھلی نے اس کے فیصلے کو من وعن تسلیم کر لیا تھا۔وہ اسے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتی تھی اور اگر یہی اس کی مرضی تھی

تو سارا جل اس کے اس فیصلے میں اس کے ساتھ کھڑا تھا۔جل مانس جو جل پری کی اُمید لگا کے بیٹھے تھے۔ناکام و نامراد ہو کر واپس پلٹ گئے۔مہا مچھلی نے جل پری کے بچے کو قبول کرلیا تھا۔جب اسے یہ پتا چلا کہ وہ ایک جل مانس ہے۔اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیوں کہ جل کا راجہ آگیا تھا جو جل پری کے ساتھ مل کر سارے جل پہ حکومت کرے گا۔

سڑک کنارے ایک مفلوک الحال شخص،خود سے بیگانہ ایک ٹک کسی خلائی نکتے پر نگاہ مرکوز کیے بیٹھا تھا۔سردی، گرمی، بہار،خزاں، ہراحساس سے عاری...شدید گرمی میں پہنا گرم کوٹ...سر اور داڑھی کے بال بے ترتیبی سے بڑھے ہوئے... گلے میں جل پری کا پر ڈالے اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا۔صُبح سے شام تک اسی طرح بھوکا پیاسا پڑا رہتا...ارد گرد کے لوگ ترس کھا کے کچھ دے دیتے تو ٹھیک...ورنہ نہ بھوک اسے کچھ کہتی نہ پیاس...کسی نیک بندے نے ترس کھا کے اسی جل کنارے ایک جھگی بنا دی تھی کیوں کہ وہ ایک ٹانگ کٹی ہونے کے باعث چلنے پھرنے سے قاصر تھا۔جہاں اب لوگ اسے بہت پہنچا ہوا سمجھنے لگے تھے...سب کا خیال تھا کہ یہ کوئی اللہ والا ہے۔ جسے دنیا اور دنیا داری سے کوئی غرض نہیں...اور...اگر غرض تھی تو صرف اس مور پنکھ سے...جسے وہ ہمہ وقت اپنے سینے سے لگائے رکھتا۔اگر کبھی کبھار چھوٹے بچے اسے تنگ کرنے کی غرض سے وہ اس سے چھیننے کی کوشش کرتے تو وہ مرنے مارنے پہ آجاتا تھا۔کبھی کبھار اسے شدید قسم کا دورہ پڑتا تھا اور وہ چلا چلا کر کسی کو پکارتا تھا...پھر...کسی نادیدہ وجود کی طرف لپک لپک کے خود کو گھسیٹتا ہوا لے کر جاتا تھا۔پھر آخر میں کسی کو پاس نہ پا کر باآواز بلند دھاڑیں مار مار کے رونے لگ جاتا...اس قدر درد بھری آواز...کہ ارد گرد کھڑے لوگ بھی خاموشی سے ترحم بھری نظروں سے اسے دیکھتے رہتے... پتا نہیں اس نے زندگی میں ایسا کیا کھو دیا تھا کہ اسے ایک پَل بھی چین نہیں پڑتا تھا اور وہ پھر کئی دن ہوش وحواس سے بے گانہ پڑا رہتا۔

اس دن بھی اس کی حالت تشویشناک تھی۔ وہ بار بار جل کی طرف جاتا اور پھر واپس پتّھر پہ آکے بیٹھ جاتا۔ اچانک وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ یکا یک اس کی نظر گلے میں پڑے مور پنکھ کی طرف چلی گئی جو اس بار بار کی تگ و دو کی وجہ سے دھاگے سے نکل آیا تھا۔ کہیں سے ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور وہ اُڑنے لگا۔ اس کا رُخ جل کی طرف تھا۔ وہ جو چلنے پھرنے سے ہی معذور تھا۔ اس کے پیچھے چلنے کی کوشش میں لڑکھڑا کے ساحل سمندر کے قریب ہی بُری طرح گرا تھا۔ مور پنکھ کا رُخ جل کی طرف تھا۔ مور پنکھ یکا یک سمندر میں جا گرا تھا۔ جل سے کسی کا ننھا سا وجود باہر جھانک رہا تھا اور لپک لپک کے کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہوا کے دوش پہ اُڑتا مور پنکھ جل کی سطح پہ گرتے ہی تیزی سے آگے ہی آگے سرکنے لگا۔ ننھا جل مانس کلکاریاں کرتے ہوئے... اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا...

❂❂❂

جل پری

فوزیہ تاج

سُورتی اکادمی
کراچی، پاکستان

کتاب	:	جل پری
مصنّفہ	:	فوزیہ تاج
زیرِ نگرانی	:	حمزہ ابنِ وصی، شکیل حُسین خان
طباعت	:	تنویر ایسوسی ایٹس 8291575-302 92+ Tel: +92 21-34545628 asadtanvir.ta@gmail.com
کمپوزنگ	:	محمّد علی عطّاری 2696830-300 92+
اشاعتِ اوّل	:	اکتوبر 2023
ناشر	:	سُورتی اکادمی، ٹیم موکسی، کراچی
تعداد	:	1001
آئی ایس بی این	:	978-627-7701-02-04

جملہ حقوق بحقِ سُورتی اکادمی محفوظ ہیں

پبلی کیشن کی جدید ٹیکنالوجی کے مطابق کتاب کی اشاعت کے لیے رابطہ:

+92 334-2981432

E:mail: hamza_haider@live.com

انتساب

بنتِ حوّا کے نام!

جو اَزل سے اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔

فہرست

❖ ...... تخیلات وتصوّرات کی انجذابی شکل ''جل پری''	حمزہ ابنِ وصی	9
❖ ...... فوزیہ تاج صاحبہ کے اوّلین ناول اور اَدبی سفر کا جائزہ	سیّد علی تنہا	12
❖ ...... دیباچہ	فوزیہ تاج	16
● ...... ''جل پری'' (حصّہ 1)		19
● ...... ''جل پری'' (حصّہ 2)		25
● ...... ''جل پری'' (حصّہ 3)		28
● ...... ''جل پری'' (حصّہ 4)		34
● ...... ''جل پری'' (حصّہ 5)		40
● ...... ''جل پری'' (حصّہ 6)		42
● ...... ''جل پری'' (حصّہ 7)		46

● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 8)	52
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 9)	56
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 10)	58
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 11)	63
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 12)	68
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 13)	74
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 14)	79
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 15)	84
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 16)	89
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 17)	95
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 18)	99
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 19)	102
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 20)	108
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 21)	112
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 22)	116
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 23)	120
● ...... ’’جل پری‘‘(حصّہ 24)	125

تخیلات وتصوّرات کی انجذابی شکل ’’جل پری‘‘

عام طور پر فکشن پر مبنی تحاریر جہاں استغراق کی دعوت دیتی ہیں وہیں ایسی تحریروں کے فنی محاسن قاری کو تخلیق سے ربط بحال کرنے میں مشکلات بھی مہیا کرتے ہیں۔ میں محترمہ ’’فوزیہ تاج‘‘ کا تہ دل سے سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی کتاب ’’جل پری‘‘ کے بارے تبصرہ رقم کرنے کی سعادت مجھے دی۔ میری کاوش ہے کہ میں مختصراً جامع گفت راست کی پگڈنڈیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کتاب اور اس کی مصنفہ کے تخلیقی مظاہر کو اپنی تفہیم وتشریح کے اعتبار سے پیش کروں۔

’’جل پری‘‘ ایک ایسی کتاب ہے جس کا تعلق ادب برائے ادب اور اَدب برائے زندگی دونوں سے ہے۔ کہیں محترمہ فوزیہ تاج کا تخیل حقیقت کے سامنے زجاجی حقیقت کی صورت اُمنڈتا نظر آتا ہے اور کہیں فوزیہ تاج صاحبہ کی تحقیق ان کے تخیل وتیقن کی رُوداد محسوس ہوتی ہے۔ میں اس کتاب کے رموز بیان کرنا مناسب نہیں سمجھوں گا کیوں کہ یہ قاری کے ساتھ زیادتی ہوگی کہ اس کے باطن سے کہانی کے بارے اشتیاقی کیفیت کو معدومیت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرا قصد فوزیہ تاج صاحبہ کے اسلوب اور تخیل وتحقیق مع قلم کاری کے اسالیب کی نشاندہی ہے جو قابلِ اعتراف ہیں۔

’’جل پری‘‘ کتاب کو پڑھتے ہوئے مدرکہ کیفیات اپنے اشتداد کا مظہر پیش کرتی ہیں۔ جس طرح سے ’’جل پری‘‘ کے روپ کو فوزیہ تاج نے تمثیل وتشبیہ کے طور استعمال کیا وہ آسان

نہیں بلکہ یہ کتاب ایک تجربہ کار لکھاری کی کثرت کی پیش کش معلوم دیتی ہے۔ اگر ہم کتاب ’’جل پری‘‘ کی ضخامت کو زیرِ بحث لائیں تو قاری ششدر رہ جاتا ہے کہ ایک کتابچے کی مماثلت رکھنے والی کتاب اپنے اندر کن کن مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ اگر ایک قاری تعمق و ژرف نگاہ سے مطالعہ کرے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب احساسات، خیالات، تغیرات، تعلیلات، تعلیمات کی کئی صورتیں پیش کرتی نظر آتی ہے۔

فوزیہ تاج صاحبہ کی ادبی زبان کا ذکر کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ’’جل پری‘‘ اس کی بہترین دلیل ہے۔ معتدل الفاظ، خیالات و واقعات کا ربط، منظر کشی کا اندازِ بیان آسان الفاظ کے ساتھ ساتھ قاری کے لاشعور کو جھنجوڑتا محسوس ہوتا ہے۔ فوزیہ تاج کا مضمون ’’جل پری‘‘ اس کتاب کے حوالے سے ویسے ہی ایک عام قاری کو قلبی طور امالہ کرتا ہے کہ فی الفور اس کتاب سے رفاقت کا رشتہ استوار ہو سکے۔

’’جل پری‘‘ بنیادی طور پر رُوداد اور داستان گوئی کا ایسا مظہر ہے جس کی استعماریت محترمہ فوزیہ تاج کے ذہنی دفتر میں تشکیل پائی ہے۔ ہر باب اپنے اندر ایک پورا منظر نامہ رکھتا ہے اور پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آنکھوں کے سامنے پورا منظر محسوس ہو رہا ہو۔ فکشن، انفرادیت، اجتماعیت، مشاہدات کے ایک ایسے نظم کو استقرار کا درجہ دینا نہایت مشکل ہوتا ہے، مگر فوزیہ تاج نے اپنی قلم کی طاقت سے اپنے مضمون کو بے جان نہ ہونے دیا۔ ادبا اور مؤقر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ فوزیہ تاج صاحبہ دیانت داری کے ساتھ اپنی تحریروں میں رنگ بھرتی محسوس ہوتی ہیں اور زندگی کے رنگوں پر مبنی برش سے اپنا خیال قرطاس پر پینٹ کرتی ہیں۔

جس طرح ایک مصوّر اپنے شاہ کاروں میں غیر معمولی مناظر منعکس کرنے کے بعد پیغامات کی ترسیل کا ایک نظم پیدا کرتا ہے اسی طرح فوزیہ تاج صاحبہ نے اپنے شعوری تخیلات کی الگنی پر چلتے ہوئے نظر آنے والے ہر منظر کو کتاب ’’جل پری‘‘ میں عکس کیا ہے۔ ان کی کہانی

اقساط کے اشتمال پر تشکیل دی گئی ہے اور جس طرح سے انھوں نے جھل مگسی اور مختلف کردار کے معاملات کو قلم سے تصویر کیا ہے وہ ایک ایسا مصنّف ہی کرسکتا ہے جو شعوری و لاشعوری طور پر ربودگی کا شکار نہیں بلکہ اپنے شعور کی کسوٹی کو اپنا ہتھیار سمجھتا ہو۔ ''جل پری'' کی کتاب پڑھتے ہوئے قاری محترمہ فوزیہ تاج کے نہ صرف تخیل سے ربط استوار کرے گا بلکہ اس کتاب کو بطورِ نصاب ایک ادبی پارہ تسلیم کرے گا۔ حقائق پر مبنی تاویلات و توجیہات اس کتاب کی تراکیب و ترویج کا خاص رُخ آشکارا کرتی ہیں۔

روایت و جدت کے اسلوب کے ساتھ فوزیہ تاج صاحبہ کے لکھنے کا انداز ہر انسان کے انفرادی وجود کا مقدمہ پیش کرتا ہے اور خاص کر اجتماعیت کے مخفیات کو بھی ایک خاص طرق سے بیان کرنے کی اعلیٰ مثال فوزیہ تاج کے یہاں ملتی ہے۔

محترم فوزیہ تاج کی اس کاوش کو جتنا سراہا جائے کم ہے جب کہ وہ اپنی گھریلو اور سرکاری ذمے داریوں کو ابھی اپنی زندگی کا اچھا خاصہ حصّہ ہبہ کرتی آئیں ہیں اور مستقبل بھی اس امکان سے بھرا ہے۔ اتنی مصروفیت کے بعد بھی اپنی تخلیقی کاوشوں کو تقویت بخشنا اس بات کے اثبات فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنی فطرت میں ایک معتبر لکھاری ہیں۔ ان کے اس سفر کو استقلال کے ساتھ جاری و ساری رہنا چاہیے۔ محترمہ فوزیہ تاج کو اسی طرح شعور کے منازل طے کرتے رہنا چاہیے اور اپنے علم سے دوسروں کو مستفید بھی کرتے رہنا چاہیے کیوں کہ یہ ان پر ملزوم ہے۔ ''جل پری'' اپنے اندر ایک منفرد ادبی پارہ ہے جو نہ صرف قاری کو خوش خیالی فراہم کرتا ہے ساتھ ساتھ فوزیہ تاج کی غیر معمولی قابلیت کا اعتراف بھی کرواتا ہے۔

حمزہ ابنِ وصی

نثر نگار

سورتی اکادمی

فوزیہ تاج صاحبہ کے اوّلین ناول اور اَدبی سفر کا جائزہ

سنگ ریزے و جل پری کی مصنّفہ لطیف و حسین جذبوں کی مالک معروف شاعرہ، ادیبہ محترمہ فوزیہ تاج صاحبہ ایک بہترین شاعرہ کے طور پر تو اپنے آپ کو ادبی حلقوں میں بہت پہلے ہی منوا چکی ہیں مگر وہ کتنی بڑی ادیبہ بھی ہیں اس کا ثبوت ہمیں ان کے منظرِ عام پر آنے والے اس ناول میں ملتا ہے۔آپ کی اس نثری تخلیق جو ایک ناول کی شکل میں ہے اس سے قبل بھی آپ نے مضمون نگاری کے ایک انعامی مقابلے میں پاکستان بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی اور آپ کے اعزاز میں راولپنڈی آرٹس کونسل میں ایک عالیشان پروگرام بھی منعقد کیا گیا جس میں مجھ خاکسار کو بھی مدعو کیا گیا۔آپ کی یہ کامیابی اس بات کی واضح غمازی کرتا ہے کہ آپ اُردو اَدب کی متعدّد اصناف پر بخوبی طبع آزمائی کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔محترمہ فوزیہ صاحبہ سے میرا ادبی رشتہ دیرینہ ہے چند سال قبل آپ کے اوّلین شعری مجموعے سنگ ریزے کے بعد اب ان کے اوّلین ناول ''جل پری'' کو منظرِ عام پر دیکھ کر فرطِ حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک ایسے شعبے سے وابستہ شخصیت جن کا پالا سارا دن جرم اور مجرموں سے پڑتا ہے۔وہ ایک بے مثال شاعرہ اور ادیبہ بھی ہیں۔

چوں کہ ہمارے ارد گرد کا ماحول انسان پر اثر انداز ضرور ہوتا ہے تو ایسے حالات میں طبیعت میں تلخی یا سختی کی توقع کرنا ایک عام سی بات ہو سکتی ہے مگر اس کے برعکس فوزیہ صاحبہ

کے اندر کے چھپے حساس ولطیف جذبوں نے ایک بہترین شعری اور اَب نثری تخلیق کو منظرِ عام پر لا کر اس بات کی نفی کر دی کہ ہیرے پر مٹّی کی گرد پڑنے کے بعد بھی وہ ہیرا ہی رہتا ہے یعنی ظاہری ماحول خواہ وہ کتنا ہی گرد آلود ہو مگر وہ ایک باکردار و باضمیر حساس انسان کے باطن کو کبھی میلا نہیں کر سکتا۔ ایک اچھا قلمکار ہونا الگ موضوع ہے، ایک بہترین انسان ہونا الگ موضوع اور محترمہ فوزیہ تاج صاحبہ میں یہ دونوں خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ آپ ایک نیک دل، انتہائی شفیق مہمان نواز، جامع الکمالات، نجیب الطرفین پیکرِ اخلاص و عجز و انکسار شخصیت کی حامل ہیں۔ آپ سے مل کر صدیوں کے غم غلط ہو جاتے ہیں۔ آپ اتنے بڑے عہدے پر فائز ہیں مگر گھمنڈ آپ کو چھو کر نہیں گزرا کیوں کہ آپ امن چاہتی ہیں، زندگی کا تحفظ چاہتی ہیں، انسانیت کا احترام اور حقوق کا تحفظ چاہتی ہیں۔ آپ کا المیہ یہ ہے کہ آپ بہت حساس اور انسان دوست شخصیت کی مالک ہیں۔

آپ کی شخصیت میں ٹھہراؤ ہے مستقل مزاجی ہے۔ دوسرے کی بات کو انتہائی توجّہ سے سننا اس کا دھیمے لہجے میں جامع اور مختصر جواب دینا آپ ہی کا خاصہ ہے۔ آپ اپنی ذات کی غلام گردشوں میں قید نہیں بلکہ انسانیت کی اصل معراج سے بخوبی آشنا ہیں۔ آپ ہر دوسرے انسان کو خود سے اعلیٰ و ارفع سمجھتی ہیں خامیوں کو چھوڑ کر خوبیوں پر نظر رکھنے والی اعلیٰ اوصاف کی مالک ہیں۔

ہمارے اس مشرقی معاشرے کا المیہ ہے کہ یہاں عورتوں کو قدم قدم پر تحفظات کا سامنا ہوتا ہے ایسے کڑے حالات میں جہاں مستورات کے حوالے سے ادبی فضا گھٹن زدہ ہو۔

کسی شعری یا نثری تخلیق کا منظرِ عام پر لانا بہت بڑی بات ہے مگر محترمہ فوزیہ تاج صاحبہ کے اندر کے چھپے ہوئے حساس و توانا جذبوں نے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کر دکھایا۔

آپ کی دونوں کتابوں کا مطالعہ کیا۔ بلاشبہ آپ کی شعری و نثری تخلیقات حرفِ آغاز سے حرفِ انجام تک بیحد عمدہ اسلوب پر مشتمل ہیں۔

آپ نے اپنے ناول میں مختلف کرداروں کو موضوعِ گفتگو بنا کر دراصل پتّھر دل زمانے والوں کا کوڑھ زدہ چہرہ بے نقاب کیا جہاں قدم قدم ہر رسموں رواجوں کی پابندیاں ہیں تلخ لہجوں کے نشتر ہیں طنز رویوں میں بسی سرد مہری ہے جو ایک دن خود بھی انسان کو پتّھر بنا دیتی ہیں۔

کرداروں کے ساتھ انصاف کرنا کا فن بخوبی آپ کو آتا ہے ناول میں کرداروں کا آپس میں ربط بے مثال ہے ایسی روانی سے شروع کرتی ہیں کہ قاری اس کو ختم کیے بنا سانس نہیں لیتا جو دیکھتی ہیں محسوس کرتی ہیں اسے من وعن بیان کرتی ہیں۔ آپ متعدد موضاعات کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنے کا مکمل ہنر رکھتی ہیں۔

محترمہ فوزیہ تاج صاحبہ کی تخلیقات کسی مبتلائے عشق کی وارداتِ قلبی یا اپنی غربت پہ نوحہ کنا کا نام نہیں بلکہ آپ تو زمانے والوں کی آنکھ ہیں ان کا آئینہ ہیں جس میں دنیا والے اپنا حقیقی عکس دیکھتے ہیں۔ آپ ہر انسان کے جذبوں کی ترجمان ہیں۔ آپ کا فکری وعلمی کینوس صرف کاکلِ پیچاک یا چاند چہرے تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ آپ کے الفاظ تو حسین پھولوں کا گلدستہ ہیں جس میں ہر رنگ کا پھول شامل ہے اور آپ الفاظ کے ان پھولوں کی مہک سے زمانے کی سانسوں کو مہکا رہی ہیں اور آپ اپنے لفظوں کے نور سے ظلمت بھرے جہاں کو منور کر رہی ہیں۔

آپ دنیا میں بسنے والی ہر ذی رُوح سے محبت کرتی ہیں۔ آپ ہر ایک کی فغاں کو اپنی فغاں سمجھتی ہیں اور قدرت کی بنائی ہوئی ہر چیز کو تخیل کی آنکھ سے دیکھ کر اپنے لفظوں میں قلمبند کرتی ہیں۔

اگر آپ اسی طرح ادب کی آبیاری کرتی رہیں اور آپ کے اندر آگے بڑھنے کی طلب کبھی کم نہ ہوئی۔قابل اساتذہ،مشاہدۂ کائنات وسیع وعمیق مطالعہ کا دامن نہ چھوڑا اور آپ اپنے ان لطیف جذبوں کو اسی طرح لفظوں کا پیرہن پہناتی رہیں تو بہت جلد ہزارہ کی دھرتی اپنی اس دختر پر فخر کرے گی۔

اپنی بساطِ تحریر سمیٹتا ہوں دعا گو ہوں کہ خدائے لم یزل آپ کو کامیابیوں اور کامرانیوں سے سرفراز فرمائے۔

آپ کے رزقِ قلم اور کڑی ریاضت وسیع وعمیق مطالعہ مشاہدۂ کائنات میں دن بہ دن اضافہ ہو۔مولائے کائنات؈ آپ کو ادب کے اُفق کا چمکتا دمکتا ستارا بنا دے اور آپ کے رزقِ قلم رزقِ سخن میں مزید اضافہ فرمادے۔آمین

دُعا گو

سیّد علی تنہا

شاعر،ادیب،تبصرہ نگار

دیباچہ

''جل پری'' ایک علامتی کہانی ہے جسے مَیں نے داستان کے طور پر بیان کیا۔ مَیں دراصل اپنے معاشرتی نظام کو ایک عرصے سے دیکھ، سُن اور پڑھ رہی ہوں اور ہمارے اس معاشرے میں عورت نامی مخلوق اس بے دردی سے پستی ہے کہ اس طرح تو چکّی کے دو پاٹوں کے درمیان شاید گندم بھی نہیں پستی ہوگی۔ عورت کے بارے میں بہت سی کہانیاں لکھی گئیں۔ اس کے حسن و جمال سے لے کر محبت، وفا اور بے وفائی تک کے بارے میں بھی دل کھول کر لکھا گیا۔ دردمندوں نے اس پہ ڈھائے جانے والے مظالم بھی بیان کرنے میں کوتاہی نہیں کی لیکن میں ایک ایسا کردار تخلیق کرنا چاہتی تھی جو اس سے قبل کسی نے تخلیق نہ کیا ہو اور میری جستجو مجھے دنیا سے ہوتی ہوئی سمندر کی تہ میں لے گئی جہاں سمندری مخلوق میرے ناولٹ کا موضوع بن گئی اور ''جل پری'' اس کہانی کے مرکزی کردار کے طور پہ سامنے آئی۔ پھر مجھے ایک طویل عرصے تک سمندری مخلوق کے ساتھ زیرِ سمندر رہنا پڑا۔ لکھتے وقت میں واقعی خود کو جل پری کی ہمجولی بنا لیتی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے اپنے کسی بہت قریبی دوست کا غم گسار بننا۔ جس کے پاس آپ کے علاوہ کوئی ایسا شخص نہیں ہوتا جس کے سامنے کتھارسس ہو سکے۔

مَیں نے جب بھی کوئی کردار تخلیق کیا قارئین کو شاید سُن کر حیرت ہوگی کہ وہ مجھ سے

بات کرتا ہے... میرے سامنے آنسو بہاتا ہے اور اپنا آپ خود، مجھ سے لکھواتا ہے۔اس کہانی کے ہر کردار کو مَیں نے دل سے تخلیق کیا اور اپنے جذبات سے ان میں رنگ بھرا۔ پھر جب کچھ پڑھنے والوں نے مجھ سے سوال کیا کہ:

''کیا آپ کافی عرصے تک آبی مخلوق کے ساتھ سمندر کی تہ میں قیام پذیر رہی ہیں؟؟''

اس سوال سے بطور لکھاری مجھے دلی تسکین ہوئی کہ میں کہانی لکھنے کے اس عمل میں، جہاں جہاں جاتی رہی وہیں، قاری کی اُنگلی تھامے اسے بھی ساتھ ساتھ لے جانے میں کامیاب رہی۔ جب ایک لکھاری کوئی کردار تخلیق کرتا ہے تو وہ پہلے خود ان کرداروں کے ساتھ اُٹھتا، بیٹھتا بلکہ جیتا ہے۔ان کے ہنسنے پہ ہنستا اور رونے پہ روتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسے اپنے کرداروں سے اُنسیت سی ہونے لگتی ہے اور وہ کامیاب تب ہوتا ہے جب وہ اپنے قارئین کو بھی اپنے کرداروں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے اور جینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ پھر قارئین بھی ان کرداروں سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ان کے دُکھوں پہ رنجیدہ اور خوشیوں میں خوش ہوتے ہیں۔

کہانی لکھتے وقت کسی قسم کی منظر کشی کرنا ایک بے حد مشکل امر ہے۔ معمولی سی بھی بھول چوک سے بیانیے پر سے قاری کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور آنکھوں کے سامنے سے منظر سرک جاتا ہے اور کہانی کے ساتھ ساتھ قاری پہ بھی جمود طاری ہو جاتا ہے۔ لہٰذا میں نے سمندر کے اس سفر کے دوران ایک لمحے کے لیے بھی پلک نہیں جھپکی اور کوشش کی کہ قاری اپنے آپ کو سمندری دنیا اور اس کی مخلوق میں اجنبی نہ محسوس کرے۔اپنی اس کاوش میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں اس کا جواب تو قارئین ہی بہتر طریقے سے دے سکتے ہیں۔

اس کہانی میں مثبت کرداروں کے ساتھ کچھ منفی کردار بھی ہیں جو کہانی میں افسانوی رنگ ہونے کے باوجود حقیقت سے قریب کر دیتے ہیں کیوں کہ بعض اوقات تخیلاتی و دیومالائی کردار تخلیق کرتے وقت لکھاری اس قدر مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے کہ تحریر کا حُسن ختم

ہو جاتا ہے لہٰذا میں نے بھرپور کوشش کی ہے کہ ان تمام دیومالائی کرداروں کو تخلیق کرتے ہوئے حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑوں۔

مجھ سے یہ سوال بھی کیا گیا کہ میرے ذہن میں یہ اچھوتا خیال کیوں کر آیا کہ مَیں نے عورت کی معاشرتی وسماجی حیثیت اور مسائل کو اُجاگر کرنے کے لیے اسے جل پری کے روپ میں ڈھال کے پیش کیا۔ جل پری دراصل ہمارے معاشرے کا ہی ایک جیتا جاگتا کردار ہے جسے استعاراتی وعلامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اسے جل پری کے روپ میں بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح جل پری ایک نامکمل عورت ہوتی ہے اس طرح عورت بھی ہمیشہ نامکمل ہی رہتی ہے۔ اس کی آدھی زندگی والدین کے گھر اور بقیہ شوہر کے ساتھ گزرتی ہے۔ خود سے جڑے رشتے تیاگ کر وہ ایک نئی زندگی میں قدم تو رکھ لیتی ہے... مگر تکمیلِ ذات کی جستجو میں تا عمر ہی برسرِ پیکار رہتی ہے اور آخر کار یہ عقدہ کھلتا ہے کہ وہ تو ہمیشہ سے ہی ادھوری تھی... اور... اسے ہمیشہ ہی ادھورا رہنا ہے پھر نہ ہی آگے بڑھنے کا راستہ دکھائی دیتا ہے اور نہ پیچھے مڑ سکتی ہے۔ زندگی کی منجدھار میں پھنسی ہوئی عورت پھر جل پری بن جاتی ہے جو ساری عُمر ساحلوں پہ بین کرتی رہتی ہے جس طرح جل سوکھ جانے پہ سوکھے جل کی مچھلیاں... زندگی سے مات کھا جاتی ہیں...!!

فوزیہ تاج

”جل پری“ (حصّہ 1)

وہ ایک جل پری تھی۔کسی رانی کی طرح ایک جل میں رہتی تھی۔وہ زندگی بہت خوب صورت تھی۔نہ کوئی دُکھ، نہ تکلیف، سارا وقت مستیاں کرتی۔سکھیوں سے کھیلتی، مچھلیوں سے باتیں کرتی۔اپنی رنگ برنگی خوب صورت لمبی دُم کے ساتھ اِدھر اُدھر قلانچیں بھرتی پھرتی تھی۔وہ بے حد خوب صورت اور دلکش تھی۔اس کا آدھا اُوپری دھڑ انسانی عورت کا سا تھا اور آدھا دھڑ کسی بڑی خوب صورت مچھلی جیسا تھا۔اس کی دُم پہ جا بجا رنگین دیدہ زیب چھوٹے بڑے نگینے جڑے تھے۔ہر نگینے کا رنگ دوسرے سے جدا اور سب سے حیران کن بات کہ وہ نگینے اس کے مزاج کے مطابق اپنا رنگ بدلتے رہتے تھے اور رات کے اندھیرے میں پانی کی لہروں میں ہیرے کی مانند جگمگ جگمگ کرتے تھے۔وہ واقعی میں جل کی ملکہ تھی۔اس کے ماتھے پہ بہت ہی خوب صورت اور بنفشی رنگ کے دو مور پنکھ تھے جو کہ اس کی پیشانی میں ہی پیوست تھے اور اس کی خوب صورتی کو چار چاند لگاتے تھے۔سورج کی نارنجی شعاعیں جب ان

پر پڑتیں تو ان کا بنفشی رنگ چمکتے ہوئے سورج کی طرح ہو جاتا تھا۔ ان پروں کے ساتھ عجیب وغریب داستانیں جڑی تھیں جو وہ اکثر اوقات مہا مچھلی سے سنتی رہتی تھی۔

ضلع جھل مگسی بلوچستان کی ایک ڈسٹرکٹ ہے۔ مگسی ایک قبیلے کا نام ہے اور چوں کہ وہاں یہی قبیلہ آباد ہے اور سب سے بڑا بلوچ قبیلہ ہے اس لیے وہ جھل مگسی یعنی مگسی قبیلے کی قیام گاہ کہلاتا ہے۔ اس علاقے کی وجہ شہرت پیر چتر ال شاہ نورانی اور موتی گوہرام مزار، جسے (بلوچستان کا تاج محل) بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پہ ایک بہت بڑا سمندر تھا جس کا ساحل بہت عرصے تک غیر آباد رہا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ساحل سے کافی دُور کچھ ریستوران کھل گئے اور سیاحوں نے بھی ادھر کا رُخ کرنا شروع کیا۔ مقامی لوگوں کو روزگار کا ذریعہ میسّر آ گیا۔ لوگ وہاں ریستورانوں تک تو آتے لیکن ساحلی علاقے کے قریب آنے کی کبھی کوشش نہ کرتے کیوں کہ اس علاقے سے عجیب وغریب کہانیاں منسوب تھیں۔ کسی نے وہاں ایک بڑے پتّھر کے پاس عجیب وغریب مخلوق کو دیکھا تھا جس کا چہرہ بے حد خوب صورت عورت کی طرح جب کہ نچلا دھڑ ایک بڑی مچھلی جیسا تھا۔ سنا ہے کہ وہ انسانوں کی بستی میں کافی آگے تک آجاتی تھی اور کسی کے دیکھ لیے جانے پہ سرکتی ہوئی ساحل سے قریب اس ویران مزار میں چلی جاتی جسے موتی گہرام کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور وہاں پہ موجود باشندوں میں سے کسی کو علم نہیں تھا کہ آنے والے وقتوں میں یہ ویران و بے آباد مزار بلوچستان کے تاج محل کے نام سے یاد کیا جائے گا اور اس کے نواحی علاقے کا نام جل پری کی نسبت سے ''جھل پری'' رکھ دیا گیا۔

مہا مچھلی! یہ جل پری کی پیشانی پہ مور پنکھ کیوں ہیں۔ ستارہ مچھلی نے اس دن اچانک مہا مچھلی سے پوچھا، جب وہ سب دائرے کی صورت میں مہا مچھلی کے ارد گرد گھومتے ہوئے کھیل کود میں مصروف تھیں اور ہماری پیشانی پہ ایسے پر کیوں نہیں ہیں؟ قرمزی مچھلی نے بھی مہا مچھلی سے سوال کیا اور مہا مچھلی، یہ ہمارے جیسی کیوں نہیں ہے۔ سرمئی مچھلی بھی

سوال کرنے میں پیچھے نہ رہی ۔آخر رنگیلی مچھلیوں نے یکے بعد دیگرے وہ سب سوال پوچھ ہی ڈالے، جو ان کے دماغ میں اکثر و بیشتر کلبلاتے رہتے تھے ۔مہا مچھلی جو خاموشی کے ساتھ ان کے کھیل تماشے کو دیکھ رہی تھی اسی ترتیب سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات دینے لگی ۔جل پری کے ماتھے پہ لگے مور پنکھ ہی ہیں جو اس کو پانی سے باہر زمین پہ چلنے کی قوت دیتے ہیں ۔زمین پہ چلنے پھرنے اور زندہ رہنے کی طاقت اسے ان دو پروں سے ملتی ہے پانی سے باہر آنے پہ سورج کی روشنی سے اپنے لیے طاقت کشید کرتے ہیں ۔وہ انھیں بتانے لگی اور تم لوگوں کی پیشانی پہ ایسے پر اس لیے نہیں کہ تم لوگوں کو زمین پہ چلنے کا وصف عطاء نہیں کیا گیا اور یہ اسی لیے تم لوگوں جیسی نہیں اور تم لوگ اس جیسے نہیں ہو کیوں کہ قدرت نے ہر ذی رُوح کو ایک دوسرے سے مختلف بنایا ہے، کسی کو اگر ایک خوبی عطاء کی ہے تو دوسرے کو اس سے الگ کوئی ایسی خصوصیت عطاء کی گئی ہو گی جس سے دوسرا محروم ہو گا اور یہی قدرت کا اُصول ہے ۔مہا مچھلی نے انھیں سمجھایا اور مہا مچھلی اگر کبھی میرے یہ پر ٹوٹ گئے یا کسی نے انھیں توڑ ڈالا تو کیا ہو گا ۔اب کی بار جل پری نے خود سوال کیا ۔مہا مچھلی کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی کہ اگر یہ پر ٹوٹ جائیں تو تم پانی سے باہر جا کے، زمین پہ پھر جی نہیں پاؤ گی کیوں کہ یہ پر چھن جانے سے زمین پہ جینے کا یہ وصف بھی تم سے چھین لیا جائے گا ۔جل پری کو زمین سے عشق تھا ۔وہ کسی قیمت پہ ان پروں کو کھونا نہیں چاہتی تھی اور یہ راز جان لینے کے بعد وہ اپنے ان پروں کی جان سے بھی زیادہ حفاظت کرتی تھی ۔(کیا خبر تھی کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اسے ان پروں کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی)۔

اس جل میں وہ ایک ہی جل پری تھی لیکن جل میں رہنے والے انواع و اقسام سمندری جانور سب اس کے دوست تھے اور اس سے بہت پیار کرتے تھے ۔جس طرح کسی بھی جگہ کا نظام سنبھالنے کے لیے ایک سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اس کا نظم و نسق درہم برہم ہو جاتا

ہے اس طرح جل کے تمام معاملات کو چلانے کی ذمہ داری مہا مچھلی پر تھی جو انتہائی تجربہ کار، عمر رسیدہ اور جہاندیدہ تھی۔ وہ جل محل کی ملکہ تھی اور تمام جل واسی جل محل کی خوب حفاظت کرتے تھے تاکہ دوسرے جل سے آنے والی سمندری مخلوق جل محل اور اس میں رہنے والوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ جل محل میں مہا مچھلی کا راج تھا جہاں جل پری، سمندری گھوڑا، کچھ سمندری کچھوے اور رنگیلی مچھلیاں رہتی تھیں جو کہ جل پری اور مہا مچھلی کے قریبی ساتھی تھے۔ مہا مچھلی کے عائد کردہ احکامات اور اُصول وضوابط کی تمام جل واسی پابندی کرتے تھے۔ ساری مچھلیاں جل پری کی گہری سہیلیاں تھیں۔ وہ سب اس پر رشک کرتی تھیں کیوں کہ ایک تو وہ جل محل کی رانی تھی دوسرا وہ سمندر پار ساحل تک آتی جاتی تھی۔ وہ ساحل سے واپس آ کر مدھ بھری خوب صورت باتیں کرتی تھی۔ انسانوں کی باتیں، ان کے چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور لباس کی باتیں، کیوں کہ اس ساحل سے کچھ ہی دُور لوگ سیر وتفریح کی غرض سے آتے تھے اور وہ ان کی نقل وحرکت کو بہت دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔ وہ جب بھی ساحل سے ہو کر آتی۔ جل اسے بُرا لگنے لگتا۔ رنگیلی مچھلیاں، سبز اور سیاہ وسفید سمندری کچھوے، جن کے ساتھ ویسے وہ بہت مزے سے کھیلتی تھی لیکن ساحل سے واپس آ کر عجیب سی اُداسی اسے گھیر لیتی تھی۔

سمندری گھوڑا اس کا دل لبھانے کی کوشش کرتا۔ ننھی رنگیلی مچھلیوں کا ٹولہ اس کے اردگرد رقص کرنے لگتا، ان کے نغمے سارے جل میں گونج رہے ہوتے مگر اسے آواز ہی کہاں آتی۔ وہ تو اپنا سب کچھ اس بھیگے ساحل پہ چھوڑ کے آجاتی تھی۔ جہاں اسے من موہنی سی صورت اور خوب صورت باتیں کرنے والا ایک آدم زاد بھا گیا تھا۔ اس نے مہا مچھلی سے انسانوں کی بستی کی بہت سی کہانیاں سُن رکھی تھیں اور وہ نئی نئی دنیائیں کھوجنے کی شوقین یہی سب دیکھنے کے لیے ساحل پہ آتی تھی۔ اسے عجیب سی کشش اپنی جانب کھینچتی تھی۔

وہ جل سے باہر آتے ہی جا بجا بکھری چمکیلی ریت سے اپنا جسم سکھاتی پھر ایک بڑے پتّھر کے پیچھے چھپ کر وہاں سے دُور ساحل پہ موجود آدم زادوں کو دیکھا کرتی تھی۔وہ بہت مدھر گاتی تھی۔گانا تھا کہ سوز و گداز میں لپٹی لہروں کا ترنم جس کی تال میل ایک اجنبی سے جڑ گئی تھی۔وہ اسے بڑے پتّھر کے کنارے بے ہوش پڑا ملا تھا کیوں کہ ساحل کے اتنے قریب کوئی بھی نہیں آتا تھا۔وہ شاید راستہ بھٹک کے یہاں آگیا تھا۔وہ نہایت آہستگی کے ساتھ اسے ہوش میں لانے لگی۔اسے مہا مچھلی کی تمام ہدایات اس وقت بھول چکی تھیں کہ اسے کبھی بھی کسی آدم زاد کے قریب نہیں جانا اور یاد تھا تو فقط اتنا کہ اسے ہوش میں کیسے لانا ہے بالآخر اس کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور وہ ہوش میں آگیا۔اس کی بَل کھاتی دم میں جمع شدہ پانی کے نرمل چھینٹے اسے ہوش میں لانے میں کامیاب ہو گئے۔وہ حیران سا ہو کر اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔اب گھبرانے کی باری اس کی تھی۔وہ بَل کھا کر ایک ہی پَل میں ساحل کی ریت سے پھسل کر جل کے اندر چھپ جاتی مگر بُرا ہو اس کی دُم کا، جو عین اس وقت اس کے سامنے آگئی جب وہ جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اسے دیکھے جا رہا تھا۔وہ اپنی زندگی میں پہلی بار کسی جل پری کو دیکھ رہا تھا۔اب وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔کوئی اور ہوتا تو آدھے دھڑ والی انسانی شکل و صورت کی عورت کو دیکھ کر ضرور خوفزدہ ہو جاتا مگر اس نے جل پری کے بہت سے قصّے سُن رکھے تھے اور سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ بھی لے گا۔اس کی نظریں جیسے اس پہ جم کر رہ گئیں۔

اس نے پوچھا! کیا تم جل پری ہو؟ ہاں... میں جل پری ہی ہوں۔اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔وہ دونوں حیرت بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔کیا تم اس جل میں رہتی ہو؟ کچھ دیر کے سکوت کے بعد آدم زاد نے سوال کیا۔جل پری نے اثبات میں سر ہلا دیا اور تم... کیا... آدم زاد ہو؟ اس کے منہ سے دبی دبی آواز نکلی۔

ہاں... آدم زاد... اسے اس کے لفظ آدم زاد کہنے پہ بے اختیار ہنسی آ گئی (شکر ہے آدم خور نہیں کہا گیا) مگر تم ساحل کے اتنے قریب کیا کر رہے تھے؟ جل پری نے پوچھا! وہ اسے بتانے لگا، میں دراصل اپنے دوستوں کے ساتھ ساحل سمندر کی سیر کے لیے آیا تھا پھر وہ لوگ ساحل سے کافی ہٹ کے بنے ایک ہوٹل سے ہی گھوم پھر کے سمندر کا نظارہ کرنے لگے لیکن مجھے سمندر کو قریب سے دیکھنے کا شوق چرایا اور میں یہاں اس پتھّر پہ بیٹھا آتی جاتی لہروں سے کھیل رہا تھا کہ یکا یک ایک تیز لہر مجھے اپنے ساتھ بہا کرلے گئی لیکن شاید ابھی زندگی باقی تھی کہ دوسرے ہی ریلے نے مجھے واپس ساحل پہ پٹخ دیا اور میرا سر اس پتّھر سے آٹکرایا۔اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں۔اس کی بات سُن کر جل پری بولی! ہاں سمندر کی مہان لہروں نے تمہاری جان بخش دی ورنہ جل نگری میں داخل ہونے والا کم ہی وہاں سے واپس آتا ہے۔وہ دونوں اسی پتّھر پہ بیٹھ گئے اور ڈھیر ساری باتیں کیں۔جل پری اسے اپنے بارے میں سب بتانے لگی اور وہ اس کی ذات سے جڑے پر اسرار رازوں کے بارے میں بہت دلچسپی سے سننے لگا پھر وہ اسے اپنے بارے میں بتانے لگا کہ اسے نئی نئی جگہیں اور عجائبات دیکھنے کے شوق اور لگن نے بعض اوقات بہت بڑے بڑے خطرات اور مسائل سے دو چار کیا ہے اور جب جل پری نے اسے بتایا کہ وہ انسانی دنیا کے لوگوں کو دیکھنے کے شوق میں کئی بار اسی پتّھر کی آڑ میں بیٹھی رہی ہے اور دُور دُور سے دیکھ کر ہی اسے انسانوں کے بارے میں بہت سی باتوں کا اندازہ ہو گیا تو وہ یہ سب سُن کر بہت محظوظ ہوا۔اس کی خوب صورتی اور من موہنی صورت یکبارگی اس کے دل میں گھر کر گئی اور یوں اس پہلی مُلاقات میں ہی وہ دل ہار بیٹھا تھا جل کی رانی کے سامنے اور وہ بھی مبہوت سی ہو کے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''جل پری'' (حصّہ 2)

اس کا نام ضرار بن ہشام تھا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا فرزند تھا۔ والد کی کنسٹرکشن کمپنی تھی۔ پیشے سے انجینئر ہوتے تھے۔ پکّے پروفیشنل انسان تھے۔ایک ایک پائی کا حساب رکھنے والے اور جوڑ جوڑ کر پیسہ بنانے والے۔ اکلوتی اولاد ہونے کے باوجود کھینچ تان کر ہی خرچ کرتے۔ضرار کی والدہ کا اس کے بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا۔ پہلے پہل دادی نے دیکھ بھال کی مگر وہ بھی شہر میں رہنے کی عادی نہ تھیں اور جلد ہی واپسی کی راہ سدھاری۔ان کے بے حد اصرار پہ بھی، نہ وہ شہر رُک سکیں اور نہ ہی ضرار کو اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش کے باوجود دونوں باپ بیٹا راضی ہوئے کیوں کہ ضرار اس وقت تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔

زندگی جانے والوں کے ساتھ رکتی نہیں ہے بلکہ آگے ہی آگے بڑھتی رہتی ہے۔اس کے گھر میں بھی کچھ عرصے میں اس کی سوتیلی ماں اور دو بھائی بھی آگئے۔وہ آنے والے وقتوں میں بس ان ماں بیٹوں کے عتاب کا ہی نشانہ بنتا رہا اور اس نے زیادہ وقت گھر سے

باہر گزارنا شروع کر دیا۔ چھوٹے دونوں بھائی اس کے ہم عمر ہی لگتے تھے۔ زمانے کے سرد وگرم سہتے سہتے زندگی نے اسے کافی کچھ سکھا دیا تھا۔ اپنے سے جڑے رشتوں کی خودغرضی نے کچھ ہی عرصہ میں اسے ان سے بہت دُور کر دیا۔ اس نے بھی باپ کی خواہش پر انجینئرنگ میں داخلہ لیا لیکن وہ گھر اور گھر والوں سے فرار کی خاطر سیاحتی گروپوں کے ساتھ دُور دراز علاقوں میں جایا کرتا۔ باپ نے بھی اس کا شوق دیکھ کر منع نہ کیا۔ ویسے بھی ماں کی وفات کے بعد وہ اس کے اکیلے پن سے واقف تھے۔

اس کا باپ فارن کمپنیز کے لیے کنسٹرکشن کے کام کرتا تھا اور کئی منصوبے کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچا دیے تھے اور کئی زیرِ تکمیل تھے۔ آج کل وہ ایک ایسی کمپنی کے ساتھ منسلک تھے، جو دُور دراز، غیر آباد علاقوں کو تلاش کرتی اور اس پہ ریسٹ ہاؤس اور ہوٹل وغیرہ تعمیر کرتی، جس کی وجہ سے بعد میں وہاں بھی زندگی کا دور دورہ ہو جاتا۔ کچھ ہی عرصے میں اس کے باپ کا کام اور نام بین الاقوامی سطح پر مشہور ہو گیا۔ وہ اب ضرار کو بھی مختلف کمپنیوں کے ساتھ اِدھر اُدھر بھیجتے تھے۔

گزشتہ سال بھی انھوں نے ایک غیر ملکی کمپنی کے ساتھ ایک غیر آباد ساحل سمندر کے قریب ریسٹ ہاؤس بنانے کا ایگریمنٹ سائن کیا تھا جو کہ ضلع جھل مگسی میں واقع تھا۔ اس مرتبہ اس تمام پراجیکٹ کی ذمہ داری ضرار کے حوالے تھی۔ وہ دفتری معاملات کے ساتھ ساتھ باقی سارا وقت اس ساحل سمندر پہ گزارتا تھا۔ پوری ٹیم کو مختلف کام سمجھاتا ہوا وہ اکیلا سمندر کے بہت قریب آگے تک نکل جاتا۔ اسے عجیب سی کشش اپنی جانب کھینچتی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کا کام تقریباً مکمل ہونے والا تھا۔ وہ جب بھی ساحل سمندر کے قریب آ کر کھڑا ہوتا تو نہ جانے کیوں عجیب سا احساس ہوتا۔ ایسا لگتا کہ کوئی ہے یہاں... جو چھپ چھپ کے اسے دیکھ رہا ہے۔ اس دن بھی وہ ہر جگہ کام کے معائنے کے بعد وہاں موجود کارکنان کو ضروری ہدایات

دینے کے بعد ساحل کی طرف آنکلا۔ ادھر سے ادھر چہل قدمی اسے بہت مزہ دے رہی تھی۔ وہ دُور تلک سمندر کی لہروں کا پیچھا کرتے ہوئے کافی آگے آنکلا۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں ڈوبا تھا کہ پانی کی آتی جاتی لہروں میں سے ایک زوردار سی لہر سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اس سے قبل کہ بہاؤ کے ساتھ پانی کے اندر چلا جاتا۔ ایک تیز دھار لہر نے اسے واپس ساحل پہ پٹخ دیا اور اس کا سر پوری شدت سے ساحل سمندر پہ پڑے ایک بھاری پتّھر سے ٹکرایا، وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر وہاں بے یارومددگار پڑا رہا اور اگر وہ کچھ دیر اور وہاں رہتا تو یقیناً کسی نہ کسی سمندری درندے کی خوراک بن جاتا لیکن جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے کسی کو اپنے اُوپر جھکے پایا۔ وہ اس پہ پانی کے چھینٹے پھینک رہی تھی۔ اسے کسی انہونی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اسے بغور دیکھنے لگا۔

’’جل پری‘‘ (حصّہ 3)

کرۂ ارض کے ایک حصّے میں موجود اس لامتناہی سمندر میں چھوٹے بڑے، خطرناک، بے ضرر ہر طرح کے سمندری جانور موجود تھے۔ جس طرح آسمان پہ موجود مزید سات آسمان اور اس کی لامحدود وسعتوں میں پھیلی لاتعداد دنیائیں ہیں اسی طرح سمندر بھی اپنے اندر اَن گنت مخلوق سمیٹے ہوئے ہے۔ لہٰذا یہ سمندر بھی مختلف حصوں پہ مشتمل تھا۔ سب سے اُوپر والے حصّے میں جل محل تھا۔ جس کی ملکہ مہا مچھلی تھی اور اس کے ساتھ جل پری اور سمندر کے باقی وفادار ساتھی تھے۔ اس سمندر میں لاتعداد سمندری جانور اپنے اپنے مخصوص حصّے میں قیام پزیر تھے۔ ان ہی میں سمندری چیتا، سمندری شیر، سمندری ہاتھی کے علاوہ آٹھ ہاتھوں والا انتہائی خطرناک آکٹوپس بھی تھا۔ جل میں رائج کردہ اُصولوں کی پابندی تقریباً سب ہی چھوٹے بڑے سمندری جانور کرتے تھے اور اگر سمندری جانوروں کے مابین کسی بھی قسم کی چپقلش ہو جاتی تو معاملہ مہا مچھلی کے دربار میں پیش کیا جاتا تھا۔

مہا مچھلی! کچھ جل واسی آپ کے دربار میں پیش ہونا چاہتے ہیں۔ مہا مچھلی اپنے محل میں جل پری کے ہمراہ محوِ استراحت تھی کہ سمندری خرگوش تیرتا... چھلانگیں لگاتا مہا مچھلی سے گوش گزار ہوا۔ جل واسیوں کا یوں جل محل میں آنا اور مہا مچھلی سے ملنا روزمرّہ کے معمولات کا حصّہ تھا۔ اس لیے مہا مچھلی نے حسبِ معمول آنے والوں کا سواگت کیا۔ اس سے ملنے، کوسمک مچھلی اور آتش فشاں مچھلی آئیں تھیں۔ یہ دونوں اسی جل کے ایک حصّے میں رہتی تھیں اور نسبتاً بہت دوستانہ اور امن پسند مچھلیاں تھیں۔ کوسمک مچھلی کی شکل کسی چھوٹی سی طشتری سے مشابہہ تھی جب کہ آتش فشانی مچھلی کے جسم پر بال نما ابھار تھے۔ جب وہ سمندر کی لہروں سے ٹکراتی تھی تو قوس وقزح کے رنگوں والی روشنیاں اس کے جسم سے پھوٹتی تھیں۔ مہا مچھلی کو دونوں ہمجولیوں کا ایک ساتھ جل محل میں آنا یقیناً تشویش میں مبتلا کر گیا۔ خیریت تو ہے نا مچھلیو! تم لوگ پریشان دکھائی دے رہی ہو؟ مہا مچھلی نے دریافت کیا۔ کوسمک مچھلی نے آتش فشانی مچھلی کی طرف دیکھ کر کہا مہا مچھلی...! بات کچھ یوں ہے کہ رات میں فلیمی سنیل بغیر اجازت ہمارے گھر میں داخل ہوئی اور ادھر ادھر اگے تمام پودے خراب کر دیے۔ فلیمی سنیل دراصل زہریلے پودے کھاتی تھی اور صرف زہریلے پودے کھانے کی وجہ سے خود بھی نہایت زہریلی ہوگئی تھی۔ اس لیے اسے کوئی بھی نہیں کھاتا تھا مگر اس کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب کے مہا مچھلی نے حیرت سے دریافت کیا۔ یہی تو ہمیں نہیں معلوم مہا مچھلی وہ تو صرف زہریلی چیزیں کھاتی ہے پھر ہمیں اسی بات پہ حیرانی ہے کہ وہ ہمارے گھر میں کیا لینے آئی تھی۔ مہا مچھلی نے اسے جل محل میں پیش ہونے کا حکم نامہ جاری کر دیا۔

مہا مچھلی کے حکم پر رابن فش، فلیمی سنیل کے زہریلے جل کی طرف روانہ ہوئی تاکہ فلیمی سنیل کو جل محل میں آنے کا حکم نامہ سنا سکے۔ رابن فش صاف ستھرے پانی میں رہنے والی خوب صورت مچھلی تھی جس کے دائیں بائیں تتلیوں جیسے پر تھے۔ اس کے باوجود وہ

اپنے تیلی نما پیروں کی مدد سے سمندر کے فرش پہ چلتی پھرتی تھی۔ رابن فش زہریلے جل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ جل کے قریب پہنچ کر اس نے باآوازِ بلند پکارا... فلیمی! تم کہاں ہو...؟؟ فلیمی جو گھنے زہریلے پودوں میں سر دیے اپنے لیے خوراک کشید کر رہی تھی۔ رابن فش کو وہاں دیکھ کر حیران رہ گئی کیوں کہ اس کے زہریلے گھر کے قریب کوئی نہیں آتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ فلیمی سنیل بری یا خطرناک تھی لیکن اس بے چاری کے ساتھ مسئلہ یہی تھا کہ وہ صرف زہریلی چیزیں کھانے کی وجہ سے خود بھی زہریلی ہو چکی تھی اس لیے جہاں کہیں زہریلے پودوں کی بہتات ہوتی اسے ہی اطلاع دی جاتی، جس سے نہ صرف اس کی خوراک پوری ہو جاتی بلکہ جل زہریلی جڑی بوٹیوں سے پاک ہو جاتا۔ جتنی وہ زہریلی تھی اتنی ہی دل کی صاف اور دوسروں کی مددگار تھی یہاں تک کہ جب اس کے زہر سے جل کا پانی گدلا ہونے لگا اور کچھ جل واسی مر گئے تو مہا مچھلی نے اسے کسی بھی طرح اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کہا دوسری صورت میں اسے جل بدر کر دیا جاتا کیوں کہ سب جل واسیوں کی صحت و زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا تو ایسے میں کام آئی سمندری مکڑی... جس نے فلیمی سنیل کی رہائش گاہ کے اردگرد ایسا جال بن دیا جس سے زہریلا پانی باقی جل کے پانی کے ساتھ ملتا نہیں تھا بلکہ جال کی وجہ سے کشید ہو جاتا تھا۔ یوں فلیمی سنیل جل بدری سے تو بچ گئی لیکن اسے جل میں عام گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں تھی اور جہاں کہیں بھی اسے زہریلی بوٹیوں کی صفائی کے لیے بھیجا جاتا، پہلے سمندری مکڑی اس کے اردگرد جال بن لیتی تھی۔

رابن فش کی آواز سن کر فلیمی چونک گئی کیوں کہ یہاں جب بھی کوئی آتا تھا اسے کسی نہ کسی کام کا ہی کہا جاتا تھا۔ خیریت تو ہے نارابی... تم آج کیسے زہر جل کی طرف کا راستہ بھول گئی۔ فلیمی نے رابن فش کو پیار سے پکارا۔ دراصل تمہیں مہا مچھلی نے جل محل میں بلایا ہے۔ رابن نے اسے بتایا۔ کیا کسی جگہ کی صفائی کرانی ہے...؟ فلیمی کی چاہت تو تب ہی من میں جاگے

جب کہیں کی صفائی ستھرائی کروانی ہو،اس نے رنجیدہ سے لہجے میں کہا۔ارے نہیں...مجھے مہا مچھلی نے بھیجا ہے یہاں کہ تم ابھی فوراً میرے ساتھ چلو،تمہیں جل محل میں بلایا ہے۔فلیمی کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔کیا میرے خلاف کسی نے کوئی شکایت کی ہے مگر میں نے تو کچھ نہیں کیا۔رابن نے کہا کہ یہ تو وہاں جا کے ہی پتا چلے گا،فی الحال تو میرے ساتھ چلو۔فلیمی کے جانے کا سُن کر سمندری مکڑی نے جلدی سے فلیمی کے اردگرد جال بن دیا۔

جل محل میں مجلس لگی تھی۔ایک طرف مہا مچھلی بہت بڑے سمندری تخت پہ جل پری کے ہمراہ براجمان تھی۔سامنے کوسمک مچھلی اور قوس وقزح آتش فشاں مچھلی اور دوسری طرف فلیمی سنیل مجرم بنی کھڑی تھی۔فلیمی...!کیا تم اس بات کی وضاحت کرو گی کہ تم رات میں کوسمک اور قوس وقزح مچھلی کی رہائش گاہ پر کیا کرنے گئی تھی...؟مہا مچھلی نے پوچھا،فلیمی یہاں جل محل میں پہنچتے ہی سمجھ گئی تھی کہ کیا معاملہ ہے جیسے ہی اس کی نظر کوسمک اور قوس و قزح مچھلی پہ پڑی تھی۔مہا مچھلی!بات دراصل کچھ یوں ہے کہ مجھے ان کی رہائش گاہ کے قریب سے گزرتے ہوئے زہریلی جڑی بوٹیوں کی خوشبو آئی تھی اور اس وقت میں اگر وہاں فوراً نہ جاتی تو وہ زہر ان کی رہائش گاہ کو زہریلا بنا دیتا اس لیے میں بغیر اجازت فوراً اندر داخل ہوگئی اور ان کو ایک ایک کر کے کھانا شروع کر دیا اور جس وقت تک یہ وہاں پہنچیں تو میں ساری بوٹیاں کھا چکی تھی اور یہ جس ساز و سامان کے خراب ہونے کا الزام لگا رہی ہیں وہ میری وجہ سے نہیں بلکہ اچانک اُگ آنے والی ان زہریلی جڑی بوٹیوں سے ہوا ہے۔کوسمک اور قوس وقزح مچھلی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں اور یوں بھی میں جیسے ہی اپنی قیام گاہ سے باہر نکلتی ہوں تو اسی وقت سمندری مکڑی...میرے اطراف میں جال بن دیتی ہے۔فلیمی مزید بولی۔مانتی ہوں کہ میرے اندر زہر بھرا ہے مگر میں نے آج تک کسی کو نقصان دینے کا سوچا بھی نہیں ہے بلکہ جہاں تک ہو سکا سب کی راہ کے کانٹے دُور کیے...لوگوں کے راستے

سے زہریلی جڑی بوٹیاں صاف کرتے کرتے... میں خود اس قدر زہریلی ہوگئی کہ اب مجھے اپنے قریب سے بھی کوئی نہیں گزرنے دیتا۔ وہ بولتے بولتے دکھی ہوگئی۔ مہا مچھلی نے غصیلی نظروں سے کوسمک اور قوس و قزح مچھلی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں بے انتہا شرمندہ ہوگئیں۔ نہ صرف مہا مچھلی اور فلیمی بلکہ پورے جل کے سامنے ان کی بہت سبکی ہوئی اور اَب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ فلیمی سے معذرت کرتیں اور مہا مچھلی سے بھی معافی مانگتیں کہ انھوں نے بنا تصدیق کیے اور بغیر کسی ثبوت کے، فلیمی کے ایک اچھے عمل کو سراہنے کے بجائے اس پہ الزام دھر دیا تھا کہ وہ آج نہ صرف دکھی ہوئی بلکہ ان کی اپنی بھی سارے جل واسیوں کے سامنے بے عزتی ہوگئی۔ مہا مچھلی نے سمجھا بجھا کے اور دلاسہ دے کے فلیمی کو رخصت کر دیا۔ کوسمک اور قوس وقزح بھی دل پر بوجھ لیے جل محل سے واپس جا رہی تھیں۔ مہا مچھلی سوچ رہی تھی کہ اگر فلیمی اور اس کا خاندان اس جل میں نہ رہا ہوتا تو آج یہ سارا جل زہریلی جڑی بوٹیوں کی آماجگاہ ہوتا۔

گہرے سمندر کے حیرت انگیز باشندے جہاں بے حد مضبوط اور طاقتور تھے، اپنی اپنی مخصوص قیام گاہ میں اپنے پورے پورے خاندانوں کے ساتھ آباد تھے۔ تیس تیس، چالیس چالیس ٹن کے عفریت شارک، جن کے بڑے بڑے جبڑے دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ بڑے جانور موقع ملتے ہی چھوٹے جانوروں کو کھا جاتے تھے۔ پھر معاملہ مہا مچھلی کے سامنے پیش کیا جاتا۔ صرف سمندری کرل اور چھوٹی مچھلیاں کھانے کی اجازت تھی جن کی زندگی ہی چار دن کی ہوتی تھی اور وہ ہی تمام آبی مخلوق کی خوراک تھے۔ سمندر میں آبی مخلوق کی سیکڑوں اقسام موجود تھیں۔ جن میں سے ایک دیوہیکل نیلی ویل مچھلی بھی تھی۔ ویل دنیا کی سب سے دیوقامت سمندری جانور ہونے کے باوجود بڑے سمندری جانوروں کا شکار کرنے سے کتراتی تھی اور صرف چھوٹی مچھلیاں اور کرل کھاتی تھی۔ ان جل واسیوں میں ایک اینگلر

فش بھی تھی جس کے سر پہ اینٹینا نما کانٹا تھا جو بلب کی طرح چمکتا تھا اور شکار کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ اس کی چمکدار روشنی شکار کو اپنی طرف لبھاتی تھی۔ اسی کرہ ارض کے سب سے نچلے حصّے کی بہت خوفناک رہائشی قطرہ مچھلی تھی جس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔

''جل پری'' حصّہ(4)

قطرہ مچھلی انتہائی بدہیت اور نک چڑی تھی اور اپنے پورے خاندان کے ساتھ سمندر کے نچلے حصّے میں آباد تھی۔اس کے ساتھ والے حصّے میں سمندری کیکڑا رہتا تھا جو بہت گہرے پانی میں رہنا پسند کرتا، جسے صرف پورے چاند کی راتوں میں اُوپر دیکھا جاتا، جب سمندری لہریں اپنے عروج پہ ہوتی تھیں۔ پتا نہیں سمندر کی گہرائیوں میں رہنے والے اس کیکڑے کا چودھویں کے چاند سے کیا تعلق تھا کہ جیسے ہی پورا چاند اپنے جوبن پر ہوتا اس وقت عجیب سا سماں ہوتا، نہ صرف سمندر میں ہونے والے مدوجذر تیز ہو جاتے بلکہ ایسا محسوس ہوتا کہ سمندر کی لہریں لپک لپک کر چاند کو چھونے کی کوشش کر رہی ہیں۔ایسے میں اچانک کہیں سے سمندری کیکڑا زمین کی تہہ سے نمودار ہو جاتا اور دودھیا چاندنی میں نہائے سمندر سے باہر آ کر چاند کی طرف لپکنے کی کوشش کرتا تھا اور ایسے میں جھالر دار مچھلی بھی اپنی پوری جھالر کو پھیلا کر رقص کرتی تھی اور یہ اس کے خوش ہونے کی علامت ہوتی تھی۔ چاند کے ڈوبتے ہی اس کے

جھالر دار پر کسی چھتری کی طرح بند ہو جاتے۔اس کے علاوہ وہاں سمندری لال بیگ بکثرت پائے جاتے تھے اور ان کا کوئی مخصوص ٹھکانہ نہ تھا بلکہ یہ سمندر کے ہر حصّے میں اِدھر اُدھر دندناتے پھرتے تھے۔

اسی سمندر کے ایک حصّے میں سمندری ڈریگن، کیکڑے اور آکٹوپس تھے اور ہر ایک اپنے اپنے مخصوص حصّے میں اپنے اپنے خاندان کے ساتھ رہ رہا تھا لیکن ان سب میں سے ایک آکٹوپس بہت زہریلا، بدہییت اور خطرناک تھا۔جس کی پورے جل میں کسی سے نہیں بنتی تھی اور جیسے ہی اسے موقع ملتا وہ ہر ایک کو حتّی المقدور زچ کرنے کی کوشش میں لگا رہتا۔ جل میں موجود چھوٹا بڑا، بے ضرر، خطرناک ہر ایک جاندار آکٹوپس سے تنگ تھا کیوں کہ وہ جل میں رائج کردہ اُصول توڑنے میں ماہر تھا بلکہ اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتا تھا۔ سارے جل واسیوں کی اس سے متنفر ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ اگرچہ ننھی منی مچھلیوں اور کرل کھا کر اس کا پیٹ بھر بھی جاتا لیکن اس کی بدنیتی اور لالچ اسے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ وہ بڑی طاقتور مچھلیوں سے لے کر رنگیلی مچھلیوں تک کو چٹ کر جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ساحل سمندر سے انسانوں کو بھی گھسیٹ کر لے آتا اور انھیں اپنی خوراک بنالیتا تھا لیکن زیادہ تر اس کا شکار رنگیلی مچھلیاں ہی بنتی تھیں۔

آکٹوپس اور بعض دوسرے سمندری جانوروں کے اس ظلم سے تنگ آ کر ایک دن رنگیلی مچھلیوں نے جل پری کو کہا...جل پری...! تم مہا مچھلی کے سامنے ہمارے لیے فریاد کرو کہ یہ سب بڑے سمندری جانور، خاص طور پر آکٹوپس ہم چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتے ہیں جس کی وجہ سے ہر وقت ہماری جان کو خطرہ لاحق رہتا ہے لہٰذا اس ظلم کو ختم کیا جائے۔جل پری بولی، پیاری سکھیو! میں ہر صورت مہا مچھلی کے دربار میں تم لوگوں کی عرضی پیش کروں گی اور جل پری نے اپنے وعدے کے مطابق رنگیلی مچھلیوں کی فریاد مہا مچھلی کے سامنے پیش کی۔

مہا مچھلی سوچ میں پڑ گئی۔ (سب جل واسی پھر کھائیں گے کیا...؟) لیکن پھر بھی فیصلہ رنگیلی مچھلیوں کے حق میں ہو گیا۔ جس نے تمام کائنات تشکیل دی، جو ہر ایک کی روزی روٹی کا ذمہ دار ہے۔ وہ ہی ان کے پیٹ بھرنے کا بندوبست بھی کرے گا لیکن وہ ان معصوموں کی عرضی رد نہیں کرے گی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب مہا مچھلی نے یہ اعلان کیا کہ آئندہ کوئی بھی جل واسی کسی چھوٹی مچھلی کو نہیں کھائے گا تو سب جل واسی ششدر رہ گئے کہ پھر وہ اپنی بھوک کیسے مٹائیں گے کیوں کہ پہلے پہل سب جل واسی چھوٹی اور کمزور مچھلیوں کو سمندر میں اُگی جڑی بوٹیوں کے ساتھ ملا کے کھاتے تھے اور ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی تھی اور مہا مچھلی نے ان کی عرضی مان کے یہ حکم صادر کر دیا کہ اب تمام جل واسی صرف جل میں اگی مختلف جڑی بوٹیاں ہی کھائیں گے اور کوئی بھی کمزور اور چھوٹی مچھلیوں پہ ہاتھ نہیں ڈالے گا جو اپنے دفاع کی سکت بھی نہیں رکھتیں اور ہر ایک نے اس حکم پر سرِ تسلیم خم کیا۔ بھوک ایک جبلت تھی۔ گوشت کی اشتہا ابھی بھی۔ بہت سوں کو ترغیب دیتی تھی مگر قانون اور اُصول وضوابط کا احترام بازی لے گیا۔ کمزور اور معصوم کا احساس مزید پیار و محبت میں بدل گیا اور جب قانون کی بالادستی ہو۔ ہر ایک کی جان کی حفاظت کی جا رہی ہو تو رحمت خداوندی برسنے میں بس کچھ ہی وقت لگتا ہے۔ شاید کسی کو یقین نہ آتا کہ اس اُصول کے لاگو ہونے کے بعد جب گوشت کی بھوک اور اشتہا تمام جل واسیوں کو تنگ کرنے لگی لیکن کسی نے رائج کردہ قانون کی خلاف ورزی نہ کی تو انعام میں جل واسیوں کو وہ عطاء کر دیا گیا جس کا وہ گمان بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سمندر میں ایسی جڑی بوٹیاں اگنے لگیں جن کی شکل ننھی منی مچھلیوں جیسی تھی۔ وہ رنگ برنگی جڑی بوٹیاں اس قدر خوب صورت کہ دیکھنے میں رنگیلی مچھلیوں کے جھنڈ کی مانند دکھائی دیتیں۔ سب سے پہلے ان جڑی بوٹیوں کو توڑ کے کھانے والی جل پری ہی تھی اور وہ بھاگ بھاگ کے مہا مچھلی کو خبر

دینے آئی تھی کہ ان جڑی بوٹیوں کی نہ صرف شکل چھوٹی مچھلیوں جیسی ہے بلکہ ان کا ذائقہ بھی گوشت جیسا ہے۔ یہ خبر سُن کے سارا جل خوشی سے جھوم اُٹھا پھر تو سارے جل واسی ان عجیب و غریب ماہیت کی جڑی بوٹیوں پر ٹوٹ پڑے جس میں گوشت اور جڑی بوٹیوں...دونوں کا ذائقہ تھا۔ سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ جل واسی بے حد خوش تھے لیکن اُداس بھی...آنے والے کل کی بھوک کے خوف سے...اس جگہ پر موجود چھوٹے چھوٹے قد کے جھنڈ گوشت کے درخت لگ رہے تھے جن کے بارے میں مہا مچھلی نے بتایا کہ یہ شجر لحم ہیں جو انصاف پسندی، رحم دلی اور قانون کی پیروی کرنے کی وجہ سے انعام کے طور پہ یہاں قدرت کی طرف سے اُگ آئے ہیں اور جب تک قانون کی بالادستی، عدل و انصاف اور رحم دلی کا نظام رائج رہے گا یہ ایسے ہی نعمت بن کے جل واسیوں کو ملتے رہیں گے مگر کسی قسم کی زیادتی اور لاقانونیت تمام جل واسیوں کو اس سے محروم کر دے گی۔ پھر وہ شجر لحم ان کے لیے من وسلویٰ کی طرح خود بخود اُگتے رہے۔ جل میں ننھی منی رنگیلی مچھلیوں کی بہتات ہو گئی تھی۔ رنگیلی مچھلیوں اور دوسری کمزور سمندری مخلوق کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیوں کہ ان کی جان کو اب کوئی خطرہ نہ تھا لیکن یہ ان کی بھول تھی۔ کوئی تھا جو ابھی بھی ان کی جان کے درپے تھا۔

جل پری اپنی ہم جھولیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی کہ دو رنگیلی مچھلیاں شدید گھبراہٹ کے عالم میں وہاں آ گئیں۔ کیا ہوا رنگیلی مچھلیو...! خیر تو ہے...کیوں اتنی گھبرائی ہوئی ہو۔ جل پری نے ان سے پوچھا۔ وہ بولیں، جل پری! ہم سب کی جان ابھی بھی ہر وقت خطرے میں ہے۔ رنگیلی مچھلیوں میں سے ایک نے تیزی سے کہا مگر اب کیا ہوا ہے۔ اب تو مہا مچھلی کے حکم کے مطابق کوئی بھی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ نہیں جل پری، باقی تمام جل واسی تو پوری طرح اس قانون کی پاس داری کر رہے ہیں لیکن ابھی بھی وہ ناہنجار زہریلا آکٹوپس نہ صرف رنگیلی مچھلیوں کو...بلکہ جو اس کے قابو میں آتا ہے، اسے کھا لیتا ہے۔ انھوں نے اسے

بتایا۔جل پری۔۔۔!اب تمہیں ہی پھر ہمارے لیے کچھ کرنا ہوگا۔جل پری یہ روئیداد سُن کر گہری سوچ میں پڑ گئی اور اس نے سوچ لیا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

وہ اگلے کچھ ہی پل میں چند رنگیلی مچھلیوں کی ہمراہی میں جل کے اس حصّے میں موجود تھی جہاں زہریلا آکٹوپس اور چند دوسرے خطرناک سمندری جانور مقیم تھے۔جل پری کی اس حصّے میں آمد یقیناً غیر معمولی تھی۔سمندری کیکڑا انھیں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔۔۔خیریت تو ہے جل محل کی شہزادی اور ہمارے غریب خانے پہ۔۔۔رنگیلی مچھلیاں جل پری کے پیچھے چھپنے لگیں۔ کیا تم سب کو مہا مچھلی کے جاری کردہ حکم کے بارے میں علم ہے۔جل پری نے پوچھا، جی جی مہارانی! نہ صرف علم ہے بلکہ ہم سب اس پہ پوری طرح عمل پیرا بھی ہیں اور اَب تو اس کی ضرورت بھی نہیں رہی کیوں کہ قدرت نے ایسے مزے دار شجر لحم سے نوازا ہے کہ رنگیلی مچھلیوں کا ذائقہ ان کے سامنے کچھ بھی نہیں لیکن کوئی تو ہے جو اس قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔اب کے جل پری نے سوال کیا۔جل کی رانی! ایسا صرف وہ بدشکل اور بدہیت آکٹوپس ہی کرتا ہے۔

اگرچہ کہ باقی کسی سمندری جانور یا آکٹوپس نے کسی بھی کمزور سمندری مخلوق کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔اگر پہلے کوئی کچھ کرتا بھی تھا تو مہا مچھلی کے حکم کے بعد اور خاص طور پر شجر لحم کی فراہمی کے بعد تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ہم سب اس کی ان حرکتوں سے بہت تنگ ہیں اس نے ہماری ناک کٹوا دی ہے۔سمندری کیکڑے نے شرمندگی سے وضاحت کی۔زہریلا آکٹوپس اندر چھپا ساری گفتگو سُن رہا تھا۔اس نے جل پری کے بارے میں سُن رکھا تھا مگر قریب سے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔اس کی خوب صورتی کو دیکھ کر گنگ رہ گیا اور دل ہی دل میں عہد کیا کہ کوئی حیلہ حربہ کر کے اس حسن کی مورت کو ہر قیمت پہ حاصل کرنا ہے۔جل پری باآواز بلند کہہ گئی تھی کہ اب اگر کسی نے کسی بھی کمزور سمندری مخلوق یا رنگیلی مچھلیوں کو زک پہنچانے کی

کوشش کی یا جل میں رائج کردہ کسی بھی اُصول کو توڑنے کی کوشش کی تو اسے حکم عدولی کی کڑی سزا ملے گی۔جل پری اعلانیہ یہ سب کہہ کر رنگیلی مچھلیوں کے ہمراہ وہاں سے چلی آئی۔

مہا مچھلی! آپ کے عائد کردہ حکم کے مطابق تمام سمندری باشندے کمزور مخلوق اور رنگیلی مچھلیوں کو حتیّ المقدور نقصان پہنچانے سے گریز کرتے ہیں اور شجرلحم ان سب کی بھوک کا خوب سامان ہے، جل پری نے آکٹوپس کو تنبیہ کرنے کے بعد جب بدستور وہی حالات دیکھے تو مسئلہ مہا مچھلی کے سامنے رکھ دیا۔پھر کیا بات ہے جس نے تمہیں اور رنگیلی مچھلیوں کو پریشان کیا ہوا ہے۔

’’جل پری‘‘ حصّہ (5)

جل پری نے مہا مچھلی کو بتایا...اس آکٹوپس نے تمام جل واسیوں کا جینا اجیرن کر رکھا ہے۔شجر لحم مہیا ہونے کے باوجود وہ ابھی بھی کمزور جل واسیوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور ہر ایک کو نقصان پہنچاتا ہے۔مہا مچھلی حیرت سے سُن رہی تھی۔کیا صرف رنگیلی مچھلیوں کو کھا جاتا ہے۔اس نے پوچھا۔نہیں مہا مچھلی وہ بدنیت اور بد خصلت ہے اس کی ان عادات کی وجہ سے سمندری کیکڑوں نے اسے جل کے اس حصّے سے نکال باہر کیا ہے۔جل پری کی باتوں نے اسے پریشان کر دیا۔وہ فیصلہ کن انداز میں بولی، جل میں رائج کردہ اُصول و ضوابط توڑنے والوں کو معاف نہیں کیا جائے گا۔لہٰذا آج اسے جل کے کنارے مردہ تالاب کے پاس بھوری چٹان میں منتقل ہو جانے کا فیصلہ سناتی ہوں۔

مہا مچھلی کے حکم کے مطابق آکٹوپس کو جل کے باقی حصوں میں داخلے سے منع کر دیا گیا۔جل پری خوشی خوشی رنگیلی مچھلیوں کو بتا رہی تھی کہ اب وہ صرف بھوری چٹان میں ہی

رہے گا۔ پورا جل اس دن بے حد خوش تھا کیوں کہ ایک بہت بڑے عفریت کے ظلم وستم سے ان کی جان آزاد ہوئی تھی۔ جل پری نے رنگیلی مچھلیوں کو کہا، خوش ہو جاؤ تم سب کہ اب تو اس زہریلے آکٹوپس کو سمندری کیکڑوں نے بھی اپنے علاقے سے دربدر کر دیا ہے کیوں کہ وہ چند دن پہلے ہی کسی آدمی کا مردہ جسم نہ جانے کہاں سے اُٹھا لایا تھا۔ ایک رنگیلی مچھلی نے بتایا کہ اس مردود نے کچھ دن قبل ایک نیلے کچھوے کے نئے پیدا ہونے والے بچے بھی دھوکے سے کھا لیے۔ جل پری بولی، مگر وہ نیلے کچھوے کے بچوں کے پاس کیسے پہنچ گیا۔ وہ تو بہت حفاظت سے رکھے ہوتے ہیں۔ رنگیلی مچھلی بولی، اس نامراد نے کچھوؤں کو ڈرایا کہ دو بڑے شارک اور سمندری ڈریگن کچھوے کے گھر پہ حملہ کرنے والے ہیں انھوں نے اسے ہی ان کی حفاظت پہ معمور کر دیا اور موقع ملتے ہی ان کو کھا گیا۔ جل پری اُداس ہوگئی۔ اب مجھے سمجھ آئی کہ کچھ دن پہلے کچھوؤں کی ٹولی بے انتہا اُداس و پریشان تھی۔ وہ پرسوچ انداز سے بولی، پتا نہیں اس کے پاس کون سا ایسا گر ہے کہ سب کو اپنے دام میں کر لیتا ہے۔ رنگیلی مچھلیوں نے کہا، جل پری یہی گر تو اس کا ہتھیار ہے، جن سے وہ اپنے لیے شکار ڈھونڈتا ہے۔

کچھ ہی عرصے میں سب جل پہ اس کی حقیقت کھل گئی تھی اور تمام جل واسیوں کو سختی سے منع کیا گیا تھا کہ بھوری چٹان کے قریب سے بھی کوئی نہ گزرے۔ اب وہ آکٹوپس وہیں رہتا اور پھر بھی قریب سے گزرنے والے سمندری جانوروں کو کسی نہ کسی حیلے حربے سے پھانسنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا۔ سب سے بڑھ کر اَب جل پری کے حصول کی خواہش پھانس بن کر اس کے دل میں چبھی ہوئی تھی۔

’’جل پری‘‘ حصّہ(6)

اس دن بھی جل پری جل محل میں اپنی ہمجولیوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔مہا مچھلی...مہا مچھلی...! کچھ کیجیے جلدی...سب کی جان کو شدید خطرہ لاحق ہے۔کسی کی چیخ و پکار پہ مہا مچھلی جو کہ جل محل میں ہی موجود تھی۔گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ باہر دیکھا تو سمندری لال بیگ بھاگتے ہوئے جل محل کی طرف آ رہے تھے۔ان کا اس طرح بغیر اطلاع و اجازت جل محل میں داخل ہونا یقیناً کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔

کیا ہوا ہے نیلے لال بیگ کیوں بلا اجازت محل میں اس طرح نا وقت تمہارا آنا ہوا؟ مہا مچھلی نے پوچھا۔نیلے لال بیگ سے قبل پہرہ دار کچھوا ہانپتا ہوا اندر آیا مجھے معاف کیجیے گا مہا مچھلی...! میری تھوڑی دیر پہلے ہی آنکھ لگی تھی اور یہ نیلا لال بیگ بغیر مجھ سے اجازت لیے بھاگتا ہوا اندر چلا آیا۔مہا مچھلی نے بغیر کچھ کہے اسے جانے دیا کیوں کہ اسے کسی ناگہانی کا خدشہ ہو رہا تھا۔کہو نیلے لال بیگ...!کس بات نے تمہیں مجبور کیا کہ تم بنا اجازت جل محل میں اس طرح اچانک داخل ہوئے ہو؟ مہا مچھلی کے استفسار پر نیلے لال بیگ کی رکی سانس بحال ہوئی۔مہا مچھلی...!اگلے چند ہی دنوں میں بہت بھیانک سمندری طوفان آنے والا ہے اور

اگراس سے حفاظت کے لیے مناسب انتظامات نہ کیے گئے تو بہت تباہی مچے گی۔اوہ! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ مہا مچھلی نے گھبرا کے پوچھا، ہاں مہا مچھلی! میں سچ کہہ رہا ہوں۔میرے باقی ساتھیوں نے بھی اس خطرے کو پوری طرح محسوس کیا ہے اور سب سے بڑھ کے خطرے والی بات یہ ہے کہ اس طوفان میں نیلی ویل، شارک اور آکٹوپس بھی اپنے اپنے علاقوں سے نکل کر اُوپر آجائیں گے۔ارے نہیں... یہ کیسے ہوسکتا ہے مہا مچھلی نے پریشانی میں گھرے جواب دیا۔جل کے اُصول کے مطابق وہ جل کے سب سے گہرے حصّے میں اپنے مخصوص علاقے میں ہی رہنے کے پابند ہیں اور اگر وہ اُوپر آجائیں گے تو چھوٹے اور معصوم جل واسی پھر کہاں جائیں گے۔پھر تو ان سب کی جان کو ہر وقت خطرہ لاحق ہوگا۔یہی بات تو میں آپ کے گوش گزار کرنے آیا ہوں مہا مچھلی...! نیلا لال بیگ بے تابی سے بولا، نہیں نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ورنہ جل میں بھونچال آجائے گا۔مجھے ضرور کچھ کرنا ہوگا۔مہا مچھلی نے سوچتے ہوئے کہا کیوں کہ اس کی اطلاع کے مطابق سمندری طوفان آنے میں وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

تمام سمندری جانور اپنے اپنے مخصوص علاقے میں رہ رہے تھے اور کسی کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنے متعین کردہ علاقے سے باہر آ کر دوسرے کا سکون برباد کرے۔خاص طور پہ چھوٹے اور معصوم جانور، جو کہ نسبتاً اُوپری حصّے میں اور الگ تھلگ آباد تھے جہاں تک خطرناک سمندری جانوروں کی رسائی نہیں تھی اور وہ چھپ چھپا کے ہی آتے تھے۔سمندری طوفان کے آنے کی خبر پورے جل میں پھیل گئی تھی۔ہر کسی کو اپنی جان بچانے کی فکر لاحق تھی۔پورے جل میں خوف و ہراس پھیلا تھا۔ایسے میں مہا مچھلی نے تمام سمندری جانوروں میں سے ایک ایک تجربہ کار جانور کو جل محل بلایا۔

سب سمندری طوفان سے بچنے کے لیے اپنی اپنی تجاویز دینے لگے اور آخر کار سب اسی نتیجے پہ پہنچے کہ طوفان آنے سے قبل چوں کہ سمندری لال بیگ اطلاع کر دیں گے تو ٹھیک اسی سمے

تمام سمندری جانور گہرائیوں میں بنی مضبوط چٹانوں میں پناہ گزیں ہو جائیں گے اور طوفانی لہروں کی موجودگی تک اپنے کھانے پینے کی اشیاء کا بھی وہیں ذخیرہ کر کے رکھیں گے تاکہ اگر زیادہ دیر تک وہاں پناہ لینی پڑے تو خوراک کی کمی نہ ہو۔ مہا مچھلی نے پھر پوچھا، لال بیگو...! ذرا جلدی سے پتا لگاؤ کہ ہمارے پاس کتنا وقت باقی ہے... مہا مچھلی...! میں نے پہلے سے ہی تمام لال بیگوں کو اس کام پہ لگا دیا تھا اور ان کی اطلاعات کے مطابق صرف ایک دن بچا ہے۔ ان کے سردار نیلے لال بیگ نے جواب دیا، اور ہم نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ یہ طوفان تین دن تک رہے گا۔ دو دن شدید اور تیسرے دن اس کی شدت میں کمی آنی شروع ہو جائے گی۔ ایک دوسرے لال بیگ نے لقمہ دیا۔ سب اپنی اپنی تجاویز پیش کر رہے تھے۔ محفل برخاست ہو چکی تھی۔

چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ تمام سمندری مخلوق اپنی اپنی ضروری خوراک وغیرہ کا مناسب ذخیرہ کر کے سمندری چٹانوں کی تہہ میں جا چھپی تھی۔ مہا مچھلی، جل پری اور جل محل میں رہنے والے سمندری جانور جل محل میں ہی پناہ گزیں تھے جو پہلے ہی بہت مضبوط بنا تھا اور ہر لحاظ سے بیرونی خطرات سے محفوظ تھا۔ جس کی رکھوالی دو دیوہیکل شارک کر رہے تھے اور جل میں موجود کسی بھی چھوٹے بڑے کی ہمت نہ تھی کہ وہ بنا اجازت جل محل میں داخل ہو سکے۔ سمندری طوفان و مدو جذر کا مقابلہ ایسے بھی بڑے سمندری جانوروں کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ پورے جل پہ سناٹا طاری تھا اور آخر وہ دن آ ہی گیا جس کے خوف سے سب جل واسی چٹانوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ اس قدر ہولناک بھونچال کہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر اپنی بپھری ہوئی لہروں کو اُٹھا اُٹھا کر ساحل پہ پٹخ رہا تھا۔ چاند اپنے پورے جوبن پہ تھا۔ اس وقت جب جل پہ موت کا سکوت چھایا تھا... کسی بھی جاندار کی نقل و حرکت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایسے میں اگر کوئی ساحل کی طرف جاتا دکھائی دیا تو وہ سمندری کیکڑا تھا۔ جو اچک اچک کر چاند کی طرف لپک رہا تھا۔

سمندری گھوڑا آنکھیں بند کیے اس طوفانی ریلے سے جل کو محفوظ رکھنے کے لیے منتر پڑھ رہا تھا۔سمندری لال بیگوں سے لے کر بڑے سمندری جانوروں تک سب گہری چٹانوں میں دبکے بیٹھے رہے۔اُوپر جل محل کے مضبوط پتھّریلے گیٹ حفظ ماتقدم کے طور پہ سختی سے بند کر دیے گئے تھے۔مہا مچھلی اپنے تخت پہ براجمان باہر کی صورتِ حال پہ نظر رکھے ہوئے تھی۔جل پری خوفزدہ نظروں سے چاروں اطراف دیکھ رہی تھی۔مہا مچھلی! کیا یہ طوفانی ریلا سب کچھ تباہ و برباد کر دے گا۔جل پری کے سوال پہ مہا مچھلی نے کہا،نہیں! سب خیر ہو گی اِن شاء اللہ کیوں کہ طوفان آنے سے قبل ہی ہمیں اس بارے میں آگاہی ہوگئی تھی۔سب نے اپنے اپنے خاندانوں کو محفوظ مقامات پہ چھپا لیا اور ساتھ ہی کچھ دن کی خوراک بھی جمع کر کے رکھ لی تھی۔ورنہ اچانک سب طوفانی ریلے کی زد میں آجاتے اور بہت تباہی مچتی۔مہا مچھلی نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔جل پری باہر دیکھتے ہوئے بولی،اس کا سہرا سمندری لال بیگوں کے سر جاتا ہے۔اگر وہ آنے والے طوفان کی خبر نہ دیتے تو پھر سارے جل واسی مصیبت میں پھنس جاتے۔مہا مچھلی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،واہ آج تو بڑی تعریف ہو رہی اور وہ جو تم ہر وقت ان کی شکایت کرتی رہتی ہو کہ یہ کیوں جل محل میں آجاتے ہیں۔ مہا مچھلی کے استفسار پہ جل پری شرمندہ ہو گئی۔وہ لال بیگوں کے اودھم مچانے سے تنگ ہو جاتی تھی۔رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے طوفان تھم چکا تھا۔ٹھاٹھیں مارتی سمندر کی منہ زور لہریں ایک بہت بڑے بھونچال کے بعد پُرسکون ہو چکی تھیں۔طوفان کے بعد ایسا سکوت چھایا تھا کہ کسی ذی حس کی موجودگی محسوس نہیں ہو رہی تھی اور پھر زندگی اپنے معمول پہ آچکی تھی۔

’’جل پری‘‘ (حصّہ 7)

عشق نہ ذات دیکھتا ہے نہ قوم اور نہ ہی مذہب۔ جیب میں پڑے محبت کے سکّے کتنے ہی کھوٹے کیوں نہ ہوں انسان انھیں ہیرے جواہرات کا متبادل سمجھ کر زندگی گزارنے کے خواب ضرور دیکھتا ہے۔ جل پری اور آدم زاد بھی ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے۔ وہ ساحلِ سمندر پہ دھرے اس بڑے پتّھر کے قریب پورا پورا دن گزار دیتے۔ ایسا ہفتے میں ایک ہی بار ہوتا تھا۔ آدم زاد بھی جل پری کے عشق میں خود کو بُری طرح جکڑا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ان دونوں کے لیے وہ ایک ہی دن پوری زندگی پہ محیط ہوتا تھا جب وہ آپس میں ملتے تھے۔ وہ اسے سمندری دنیا کی کہانیاں سناتی اور اس سے انسانی دنیا کے افسانوی قصّے سُن سُن کر وہاں جانے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ مُلاقات کے بعد وہ جل میں واپس چلی جاتی اور آدم زاد اسے دُور پانی میں اُترتا دیکھ کر خود بھی اپنی دنیا میں واپس آ جاتا۔ اگلا پورا ہفتہ وہ دونوں اس ایک دن کے انتظار میں گزار دیتے تھے۔ سمے گزرنے کے ساتھ ساتھ

ان کی محبت بھی مزید گہری ہوتی جا رہی تھی۔

اس دن بھی آدم زاد اسی پتّھر کے کنارے جل پری کا انتظار کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں آج وہ آنے میں اتنی دیر لگا رہی تھی۔ ابھی وہ بیٹھے بیٹھے مایوس ہی ہونے لگا کہ سامنے پانی کے وسط میں کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی۔ وہ امید بھری نظروں سے اسی سمت دیکھنے لگا۔ وہ جل پری ہی تھی جو خراماں خراماں پانی سے نکلتی آ رہی تھی اور پھر وہ گھوم کر اپنی چمکتی، لچکیلی دم کی مدد سے پتّھر کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔ آدم زاد نے جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر اسے پیار سے تھام لیا۔ اتنی دیر کر دی تم نے آنے میں۔ میں تو اب مایوس ہو چلا تھا۔ آدم زاد نے کہا۔ آج دراصل مہا مچھلی مجھے جل کنارے نہیں آنے دے رہی تھی۔ وہ بولی، جل میں ایک زہریلا آکٹوپس ہے۔ وہ ہر جل واسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تو مہا مچھلی کا حکم تھا، کہ میں آیندہ اکیلی ساحل کی طرف نہ آیا کروں تو تم پھر مجھ سے ملنے نہیں آیا کرو گی... وہ دُکھ سے بولا تھا۔ آؤں گی... ضرور آؤں گی لیکن اب یہ بات مجھے کسی نہ کسی طرح اپنی سکھیوں کو بتانی ہو گی تاکہ مہا مچھلی تک بھی یہ خبر پہنچ جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سب پریشانیاں بھول کر ایک دوسرے سے ساتھ نبھانے کے وعدے کر رہے تھے۔

آدم زاد نے اس سے پوچھا...! کیا تم میرے ساتھ ہمیشہ کے لیے میری دنیا میں چلو گی؟ جل پری حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں کیسے انسانی دنیا میں جا سکتی ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا جل پری... ایک ایک دن میرے لیے ایک صدی کے برابر ہوتا ہے۔ مجھے تمہارے سمندری گیت بلاتے رہتے ہیں۔ میں نہیں جی پاؤں گا۔ تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیے مجھے۔ وہ اپنی بے قراریوں کے قصّے سنا کر رخصت ہو چکا تھا اور وہ اس کے جانے کے بعد ایک نئی سوچ لے کر پانی میں اُتر رہی تھی۔ پانی میں اُترنے سے پہلے اس نے مڑ کر ساحل کی طرف دیکھا۔ آدم زاد بھی مڑ کر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو

الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا دیا۔آدم زاد اس کے جانے تک وہیں کھڑا رہا۔ہلچل کرتا پانی ساکت ہو چکا تھا۔

اس نے سب سے پہلے دوست مچھلیوں کو یہ بات بتائی،انھوں نے بہت حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔جل پری اور ایک آدم زاد سے محبت...!! پھر بات ہوتی ہوئی سمندری کچھوؤں کو پتا چلی وہ سُست رفتاری سے تیرتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور یوں سمندری گھاس پر جا بجا بکھرے سمندری گھونگھوں سے ہوتی ہوئی یہ خبر مہا مچھلی تک جا پہنچی۔وہ کانپ کر رہ گئی۔ایسا کیسے ہوسکتا ہے...؟؟ ایک جل کی رانی اور آدم زاد سے محبت...!!! یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔آدم زاد بے وفا ہے اس کی سرشت میں بے وفائی اور ہرجائی پن ہے۔وہ تو اس آدم زادی سے وفا نہیں کرتا جو اس کے لیے اپنی ساری زندگی تیاگ دیتی ہے تو ایک جل پری سے کیا محبت نبھائے گا۔مہا مچھلی اسے سمجھا رہی تھی۔جل پری تم اس آدم زاد سے دُور رہو۔یوں بھی آدم زاد دنیا کی سب سے خود غرض، مطلبی اور کٹھور مخلوق ہے جس کی بے وفائی کی وجہ سے کئی آدم زادیاں اپنے آپ کو اسی جل کے حوالے کر کے اپنی زندگیوں کا خاتمہ کر چکیں۔سمندری کچھوؤں نے خود مجھے ان کے مردہ جسم دکھائے ہیں اور ایسا ہی ایک آدم زاد تم سے وفا کرے گا...؟ جو اپنی عورت کی وفا کو درخورِ اعتنا نہیں گردانتا...! ایسی باتیں اسے بتا کر سخت تنبیہ کی گئی کہ وہ آدم زاد سے دُور ہٹ جائے...جل پری بت بنے سب سُن رہی تھی۔مہا مچھلی پھر بولی، مجھے پورا یقین ہے کہ عنقریب ایک ''جل مانس'' آئے گا جو صرف تمھیں ہی چاہے گا اور وہ تمھاری دنیا سے ہوگا۔جس کے ساتھ تم سارے جل پہ راج کرو گی۔جل پری نظریں جھکائے خاموشی سے ساری گفتگو سُن رہی تھی۔مہا مچھلی نے پاس کھڑے بوڑھے مگرمچھ کی طرف اشارہ کیا۔وہ اس کا اشارہ سمجھ کے بولا، دو مختلف دنیاؤں کے لوگ کبھی بھی یکجا نہیں ہوسکتے جل پری اور اگر ہو بھی جائیں تو جلد یا بدیر جدائی ان کا راستہ روکے کھڑی

ہوتی ہے۔ ایسا قرب عارضی ہوتا ہے اور یہ ملن سوائے دُکھ، تکلیف اور مایوسی کے کچھ دان نہیں کرتا۔ وہ سب جل واسی جل پری کو سمجھا رہے تھے۔

مہا مچھلی برسوں کی تجربہ کار اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئی تھی۔ وہ جل پری کی آنکھوں میں ایک آدم زاد کی محبت کے دیپ جلتے دیکھ چکی تھی۔ جل پری نے جب اقرار کرلیا کہ وہ واقعی اس مدھر بولنے والے آدم زاد کے عشق میں گرفتار ہو چکی ہے تو مہا مچھلی اسے اس قدر تکلیف اور کرب سے دیکھ رہی تھی، جیسے اس نے عشق کے بجائے موت کو گلے لگا لیا ہو مگر اس وقت آنکھوں پہ بندھی عشق کی یہ پٹی اسے اندھا کر چکی تھی۔ آدم زاد کی محبت سب جل واسیوں کی محبت پہ حاوی ہوگئی تھی۔ اس نے کسی بھی قیمت پر آدم زاد کی ہمراہی میں اس کی دنیا میں جانے کا فیصلہ کرلیا خواہ اسے بن باس ہی کیوں نہ کاٹنا پڑے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ عشق کے سورگ واس میں زندگی گذارنے کی خواہش... اسے نرگ میں پہنچا دے گی۔

اس دن وہ سرخ بوڑھے مگرمچھ سے، جو وہاں کا بہت پُرانا رہائشی تھا، پوچھ رہی تھی کہ کیا کبھی کوئی جل پری مکمل انسانی روپ اختیار کرسکتی ہے مگرمچھ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ جل پری اسے خاموش دیکھ کر اصرار کرنے لگی... بتاؤ نا مگرمچھ دادا...!! ایسا کیا کروں کہ میں مکمل انسان بن جاؤں۔ اب چوں کہ رنگیلی مچھلیوں سے ہوتی ہوئی یہ خبر مہا مچھلی تک بھی پہنچ چکی تھی تو وہ باری باری سب سے مدد مانگ رہی تھی کیوں کہ اسے ایک بار مہا مچھلی نے ہی سمجھایا تھا کہ دنیا میں کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہے مگرمچھ کو اس کی بے چارگی پہ ترس آ گیا۔ ہاں ایسا ہونا ممکن ہے... مگر اس کے لیے تمہیں سمندری گھوڑے کے پاس جانا ہوگا۔ سمندری گھوڑے کے پاس... مگر کیوں...؟ جل پری نے سوال کیا اس لیے کہ وہ ہی جادو ٹونہ اور منتر جانتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کے پاس تمہارے مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوگا مگرمچھ کی بات سنتے ہی جل پری کی آنکھوں میں اُمید کی بجھتی ہوئی شمع پھر سے روشن ہوگئی۔ وہ

ضرور ملے گی سمندری گھوڑے سے اور آدم زاد کی محبت پانے کے لیے اپنی ہر ممکن کوشش کرے گی۔وہ دل ہی دل میں اپنے آپ سے پختہ ارادہ کر رہی تھی۔

آج جل پری وقت سے پہلے ہی آ گئی تھی اور آدم زاد کے انتظار میں مخصوص جگہ پہ بیٹھی تھی۔آج رنگیلی مچھلیاں بھی اس کے ہمراہ ساحل تک آئیں تھیں کیوں کہ جل پری نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اب کی بار جب وہ آدم زاد سے ملنے جائے گی تو وہ بھی ساحل تک ساتھ چلیں گی کیوں کہ ان کو شدید اشتیاق نے آ گھیرا تھا کہ آخر وہ کون ہے جس کے لیے ان کی سکھی تن من دھن قربان کرنے کو تیار ہو گئی ہے۔ساحل پہ بہت مزے کا کھیل جاری تھا۔جل پری ایک بڑا غوطہ مار کے ساحل سے اندر کی سمت تیزی سے جاتی اور جب سب رنگیلی مچھلیاں اس کے پیچھے جاتیں تو وہ ایک زوردار جست لگا کر ساحل پہ آ جاتی...رنگیلی مچھلیاں منہ دیکھتی رہ جاتیں... جل پری! یہ غلط ہے، ہم تمہارے پیچھے ساحل تک کیسے آئیں۔وہ زوردار قہقہہ لگا کے پھر اندر چلی جاتی۔ان کے کھیل کے دوران ہی کوئی ساحل کی طرف آتا دکھائی دیا۔رنگیلی مچھلیاں چاپ سُن کر ہی پانی میں چھپ گئیں۔جل پری پانی سے نکل کر ساحل پہ پڑے اس مخصوص پتّھر کی طرف جا رہی تھی جہاں وہ ملا کرتے تھے۔اس نے مڑ کے پانی کی طرف دیکھا۔بظاہر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اسے معلوم تھا، کہ رنگیلی مچھلیاں باہر جھانک رہی ہیں۔وہ زیرِلب مسکرا دی۔

آج تم اتنا دیر سے آئے...میں تو مایوس ہو کے واپس جانے لگی تھی۔جل پری نے اُداسی سے کہا۔آدم زاد شرمندہ ہو گیا۔تمہیں کیا پتا میں تمہاری خاطر کتنا سفر طے کر کے آتا ہوں لیکن یہ میرے دل میں تمہاری محبت ہے مجھے کھینچ کے یہاں لے آتی ہے۔کاش کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا سکتا۔وہ افسردہ لہجے میں اسے کہنے لگا۔جل پری بولی! میں تمہیں بہت جلد ایک خوشخبری سنانے والی ہوں۔آدم زاد بے تابی سے بولا۔کیا تم نے سمندری

گھوڑے سے اس بارے میں بات کی۔ جلدی بتاؤ...اس نے کیا کہا۔ جل پری ہنسنے لگی۔ کرلوں گی نا بات۔ اتنی بے صبری کا ہے کی۔ وہ دراصل تین دن سے شارک محل میں موجود ایک بیمار شارک کے لیے تپسیا کر رہا ہے۔ اس دوران وہ کسی سے بات نہیں کرتا۔ جیسے ہی اس کا چلہ ختم ہوا۔ میں اس سے ملنے جاؤں گی۔ ان دونوں نے وہ سارا دن ایک ساتھ گزارا۔ آدم زاد اپنی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی بے تابیوں کے قصّے سناتا رہا۔

''جل پری'' (حصّہ 8)

قربِ محبوب اور تکمیلِ عشق محب کے دل کی وہ خواہش ہوتی ہے جس کے لیے وہ ہر حیلہ حربہ کر گزرتا ہے۔ جادو ٹونے اور تعویذ گنڈے سب سے تھک ہار کر وہ آخر کار سمندری گھوڑے سے اب وہ منتر سیکھ رہی تھی جس سے وہ پوری کی پوری آدم زادی بن سکتی تھی۔ اگر وہ یہ منتر سیکھ لیتی تو ہمیشہ کے لیے ایک مکمل عورت کا روپ اختیار کر لیتی۔ پھر وہ آدم زاد کے سنگ چلی جائے گی۔ آدم زاد اسے اُکسا رہا تھا بار بار اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا۔ اسے ساتھ جانے کو کہہ رہا تھا۔ اس نے جل پری سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زمین کو اس کے لیے جنّت بنا دے گا اور اس دھرتی سے آکاش تک صرف اور صرف محبت کا راج ہو گا۔ وہ اس کی دکھائی ہوئی جنّت اور اس میں پھیلی محبت کے سحر میں سر تا پا جکڑی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کو انسانی دنیا کے قصّے ازبر ہو چکے تھے اور اب وہ ایک ایک منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ سب اسے اس کی محبت سے دستبردار ہونے کو کہہ رہے تھے مگر اسے بیچ سفر کے آدھے راستے

سے واپس پلٹنا اپنی زندگی کھو دینے کے مترادف لگ رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں بند نظارے اور دل میں مقید محبت سے کیسے منہ موڑ لیتی۔ وہ منزل پر پہنچنے سے قبل ہار مان کر واپس نہیں مڑنا چاہتی تھی۔ منتر تقریباً کامیاب ہونے ہی والا تھا اور عنقریب وہ ایک مکمل عورت بن جانی تھی کہ سمندری گھوڑے نے ایک بُری خبر سنادی۔

وہ سمندری گھوڑے کے روبرو کھڑی تھی۔ جب اسے یہ خبر سننے کو ملی۔ کیا... کیا کہہ رہے ہو...؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ سمندری گھوڑے نے بہت دُکھ سے اس کی طرف دیکھا... ہاں یہ سچ ہے کہ یہ منتر اختتام پہ پہنچتے ہی تم ہمیشہ کے لیے ایک آدم زادی تو بن جاؤ گی مگر اس کے بدلے اپنی قوت گویائی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤ گی۔ اسے یہ خبر سُن کر شدید دھچکا لگا۔ اسے رنگیلی مچھلیوں کے سنگ گائے گئے گیت فنا ہوتے محسوس ہو رہے تھے اور سب سے بڑھ کر اسے اس بات کا شدید قلق تھا کہ اس کے سمندری گیت آدم زاد کو بھی بہت بھاتے تھے مگر اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا اور وہ آدم زاد کو پانے کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھی۔ سمندری گھوڑے نے کہا دیکھو! یہ قربانی تو تمہیں ہر قیمت پہ دینی ہوگی۔ میں نے اپنی پوری کوشش کی لیکن یہ جل تمہاری آواز سلب کر کے ہی تمہیں یہاں سے ہمیشہ کے لیے رخصت کر دے گا۔ جل پری صدمے سے ساکت ہوگئی۔ وہ سامنے کھڑی محبت اور اس کے بدلے میں مانگے جانے والے تاوان کے درمیان اُلجھ کر رہ گئی۔ وہ خود سے سوال کر رہی تھی کیا محبت پانے کے لیے وہ اپنی آواز کا گلا گھونٹ دے۔ کیا انسانی دنیا دیکھنے اور آدم زاد کی محبت میں وہاں رہنے کے لیے وہ اتنی بڑی قربانی دے دے، پھر فیصلہ ہوگیا۔ وہ اپنی آواز جل کو دان کر دے گی۔ وہ ہر قیمت پہ آدم زاد کو حاصل کرے گی اور اس نے سمندری گھوڑے کو اپنا فیصلہ سنا دیا اور پھر وہ ہوگیا کہ جس کے لیے اسے اتنی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ آخر کار وہ سمے بھی آگیا جس دن وہ سارے جل واسیوں کی شدید مخالفت کے باوجود منتر کے ذریعے ایک

مکمل عورت بن گئی... مگر... یہ اس کی بھول تھی ایک مکمل عورت کہاں تھی وہ...؟؟ وہ تو ابھی بھی ایک ادھوری عورت تھی کہ اپنے دلکش سر اور دل کے تار چھیڑتی جلترنگ سی آواز کی لہریں تو سمندر کی تہہ میں ہی دفن کر آئی تھی۔ایک عمر کی تپسیا کے بدلے انعام کی صورت میں اپنے قدموں پہ کھڑی تو ہوگئی مگر جل کے برسوں سے رائج کردہ اُصول توڑنے کے عوض تاوان میں اپنی آواز کا نذرانہ پیش کرنا پڑا سمندری گھوڑے نے ایک گھونگھے کے سیپ میں بند کر کے سمندری گھاس کی آخری تہہ میں دفن کر دی اگر وہ ایسا نہ کرتا تو وہ آواز درد اور کرب کی صورت میں تمام جل میں بین کرتی پھرتی اور جل پری جہاں پہ بھی ہوتی آواز بازگشت بن کر اس کا پیچھا کرتی رہتی۔

پھر سمندری گیت فنا ہو گئے۔بین کرتی آواز سیپ میں بند ہوگئی۔رنگیلی مچھلیاں بھی اس دن اپنے گیت بھول گئیں سارا جل سائیں سائیں کر رہا تھا۔جس دن وہ پہلی بار اپنے پیروں پہ کھڑی ہوئی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔اس وقت وہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش قسمت عورت سمجھ رہی تھی۔وہ دھیرے دھیرے سے قدم اُٹھاتی سمندر سے باہر نکل رہی تھی۔اس کی ٹانگیں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔اسے ابھی چلنا نہیں آیا تھا مگر پھر بھی اس نے اس وادیِ عشق میں قدم رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔جس کے لیے اس نے اپنا جنم سے عطاء کردہ روپ بدلا تھا۔سب جل واسی اس کے انسانی روپ بدلنے سے بہت رنجیدہ تھے اور افسردگی سے اسے اس بدلے ہوئے روپ میں دیکھ رہے تھے اور آخر کار وہ لمحہ آن پہنچا جب وہ اپنی سریلی آواز گنوا کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئی تھی۔

ہر محبت تاوان مانگتی ہے۔خراج ادا کرتے رہو تو من و تو کی اُلجھنیں ختم ہو جاتی ہیں عشق انسان کی رُوح میں رچ بس جاتا ہے۔منازلِ عشق طے کرتے کرتے روم روم سے محبوب کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ابتدائے عشق سے لے کر انتہائے عشق تک وجودِ عشق لاحاصل

رہتا ہے کیوں کہ لوگ جسے باہر ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں اس کا ٹھکانہ تو اندر ہوتا ہے اور جب اندر خالی ہو جائے تو وجود میں بس دھڑکن ہی رہ جاتی ہے۔ ایسی دھڑکن تو بس خود کو بھی سنائی نہیں دیتی۔ ایسا ہی عشق جل پری کے دل میں بس چکا تھا کہ جس کو پانے کے لیے وہ اپنا رنگ روپ، آواز اپنی سکھیاں، سمندری ساتھی اور سب سے بڑھ کر مہا مچھلی کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے ایک اجنبی آدم زاد کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ وہ اس عشق کے حصول کے لیے بہت بھاری تاوان ادا کر چکی تھی اور آگے پتا نہیں کتنا خراج ادا کرتے رہنا تھا لیکن وہ اپنا سب کچھ گنوا کر آدم زاد کے ساتھ انسانی دنیا میں جانے کے لیے تیار تھی۔

''جل پری'' (حصّہ 9)

وہ جل چھوڑ کے جا رہی تھی۔ وہ اپنی دانست میں ایک مکمل عورت بن چکی تھی۔ رنگیلی مچھلیاں، سمندری کچھوے اور سمندری گھاس تک اس کے پیروں سے لپٹ رہے تھے۔ وہ اسے اپنا فیصلہ تبدیل کر کے، واپس آنے کے لیے کہہ رہے تھے مگر وہ جب ایک مرتبہ کچھ ٹھان لیتی تھی تو کر کے ہی دم لیتی تھی۔ سب نہ چاہتے ہوئے بھی ساحل پہ اسے الوداع کہنے آئے تھے۔

اسے جل چھوڑنے کا بے حد دُکھ تھا۔ جس دن وہ جل چھوڑ کے آدم زاد کے ساتھ جا رہی تھی، جل واسیوں کے لیے اُداس تو بہت تھی مگر آدم زاد کی ہمراہی میں چلنا، اس کی محبت پانا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن چکی تھی۔ سب اسے اپنے قدموں پہ چلتا اور رخصت ہوتا دیکھ رہے تھے۔ وہ مڑ کر انھیں آخری بار خدا حافظ کہنا چاہتی تھی مگر اس کی آواز کے ست رنگے سر بکھر گئے، لبوں پہ ہر دم رہنے والے گیت فنا ہو چکے تھے۔ اس نے

ان سب پر الوداعی نظر ڈال کر بس ہاتھ ہلا دیا۔سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔مہا مچھلی نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔وہ اس سے ناراض ہو چکی تھی۔

اس کی انکھوں میں جمے کرب و اذیت کے آنسو وہ دیکھ چکی تھی ایک نامراد اور ناکام جذبے کے پیچھے اپنی زندگی کا سودا کرنے والے ایسے ہی گھاٹے میں رہتے ہیں اور مہا مچھلی نے اسے خدا حافظ بھی اسی لیے نہیں کہا کہ برسوں کا تجربہ اسے چیخ چیخ کر آگاہ کر رہا تھا کہ اسے نامراد ہی لوٹنا ہے وہ یہیں کی ہے اور یہیں واپس آئے گی مگر تب...سب ویسا نہیں ہو گا جیسا وہ چھوڑ کے جا رہی ہے اور اگر سب کچھ ویسا ہوا بھی...تو وہ خود ویسی نہیں رہے گی۔رنگیلی مچھلیوں نے ساحل کے قریب اس کے سامنے ڈیرہ ڈالا تھا۔ایک نے سوال کیا۔کیا تم واقعی ہمیں، مہا مچھلی اور تمام جل واسیوں کو چھوڑ کے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤ گی؟ جل پری حیرت سے ان سب جل واسیوں کو دیکھنے لگی، وہ سب جو اس سے محبت کرتے تھے۔جنہوں نے اس کو خوش رکھنے کے لیے تمام حیلے بہانے کر ڈالے مگر آدم زاد کو پانے کی آرزو میں وہ سب کی محبتوں کو قربان کرنے پہ تیار ہو گئی۔اس نے انتہائی افسردگی اور بے چارگی سے جل واسیوں کی جانب دیکھا، رنگیلی مچھلیاں غم و یاس کی تصویر بنے اس کے ارد گرد گھومتی رہیں۔نیلے کچھوؤں کی ٹولی بین کرنے لگی۔یہاں تک کہ سمندری گھاس اس کے پاؤں سے لپٹ گئی اور اسے یوں محسوس ہوا کہ زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لیے ہیں۔اس کے چلنے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔بالآخر اس کے پختہ ارادے کے سامنے سب جل واسی ہار گئے اور سمندری گھاس نے بھی اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔پھر وہ سب کو غمزدہ کر کے آدم زاد کے سنگ اس کی دنیا میں چلی آئی۔

''جل پری''(حصّہ 10)

ضرار اسے کسی صورت بھی اپنے گھر نہیں لے کر جانا چاہتا تھا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ اس کی سوتیلی ماں اور بھائی کبھی بھی اسے وہاں رہنے کی اجازت نہیں دیں گے اور پھر پچھلی مرتبہ گھر گیا تو سب کے عجیب سے بدلے ہوئے رویے دیکھ کر اُلجھن میں مبتلا ہو گیا تھا جو اسے کسی انہونی کا پتا دے رہے تھے۔ اس لیے وہ بغیر وقت ضائع کیے جل پری کو اپنے گھر کے بجائے کسی دوسرے شہر میں الگ تھلگ سے بنے ایک گھر میں لے آیا۔ وہ اسے باقی معاملات سمجھانے کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت دینا نہ بھولا کہ وہ اپنے ماضی کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گی کیوں کہ اسے ڈر تھا کہ کہیں لوگ اسے انجانی دنیا کی مخلوق سمجھ کر تماشا نہ بنا لیں۔ وہ اسے سمجھانے کے بعد خود ہی ہنس دیا۔ وہ حیران ہو کے اسے دیکھنے لگی۔ ارے پگلی! تم کون سا بول سکتی ہو کہ کسی کو کچھ بتاؤ گی۔ وہ شدید دُکھ سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ اس نے اس کے ماتھے پہ پیوست پر چھپانے کے لیے ایک خوب صورت سی کیپ لا دی تھی جو اسے

اب شاید ساری عمر پہننی تھی۔اس کے پر اس کیپ میں چھپ جاتے تھے۔اچھا تو ایسا کرتے ہیں کہ سب سے پہلے تمہارا ایک نام رکھتے ہیں۔اس کے بعد آج شام میں ہی ہم دونوں کا نکاح ہوگا۔وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔وہ اس کا نام سوچنے لگا۔اس نے بہت سوچنے کے بعد اسے ''بنت البحر'' کا نام دیا تھا۔دیکھو! آج کے بعد تمہارا نام بنت البحر ہے اور سب تمہیں اسی نام سے پکاریں گے اور تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ میں آدم زاد ضرور ہوں لیکن میرا نام ضرار بن ہشام ہے۔اس نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔کاش کہ وہ اسے اس کے نام سے پکار سکتی مگر یہ خواہش ہمیشہ حسرت ہی رہنی تھی۔پھر اس نے اسے گھر چھوڑنے کے بعد مارکیٹ کا رُخ کیا تاکہ اس کے لیے کچھ کپڑے اور گھر کا ضروری سامان خرید سکے۔

جب گھر واپس آیا تو وہ اسی طرح ایک جگہ بیٹھی تھی۔اسے غصہ آگیا۔!ارے تم اسی طرح ایک جگہ بیٹھی ہو۔اب یہ تمہارا گھر ہے کچھ عرصہ تمہیں یہیں رہنا ہے پھر تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔وہ یکدم گھبرا گئی۔اسے اس پہ ترس آگیا۔اسے احساس ہوا کہ یہ سب اس کے لیے بالکل نیا ہے۔وہ رفتہ رفتہ سب سمجھ جائے گی۔اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے دھیرے دھیرے سمجھانے لگا۔تمھیں پریشان ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں۔بہت جلد ہر چیز سے آگاہ ہو جاؤ گی۔شام میں کچھ قریبی دوستوں کو ہی دعوت دی تھی۔وہ اس کے لیے ہلکے گلابی رنگ کی بے حد خوب صورت میکسی لایا تھا۔ساتھ سلور کلر کی کیپ لباس کا حصّہ معلوم ہوتی تھی کیوں کہ اس کے ساتھ ہی خوب صورت جالی کا دوپٹہ اٹیچ تھا۔اسے اس کے دوست کی بیوی نے تیار کیا تھا اور جل پری نے تیاری کے دوران کمال ہوشیاری سے اپنے پر چھپا لیے تھے۔اسی روز شام کو اس کے دو قریبی دوستوں اور ان کی فیملیز کی موجودگی میں چھوٹی سی تقریب میں ان دونوں کا نکاح ہوگیا۔سب اس کی بیوی کی خوب صورتی کی تعریف کر رہے تھے اور ساتھ ہی اس کی بے زبانی پہ دُکھ کا اظہار بھی۔ایک دوست کی بیوی نے تو ازراہ ہمدردی پوچھ لیا...ضرار بھائی!

کیا بھابی پیدائشی طور پہ ہی بول نہیں سکتی تھیں یا کسی حادثے میں یہ قوت گویائی سے محروم ہوگئیں۔وہ ضرار کی طرف دیکھنے لگی۔ضرار نے بات سنبھالی۔ارے نہیں بھابی! پیدائشی ہی ان کے ساتھ یہ مسئلہ تھا۔دوسرے دوست کی بیوی بولی! لیکن ضرار بھائی کی پسند کی داد دینی ہوگی۔اس قدر خوب صورت ہیں یہ کہ لگتا ہی نہیں اس دنیا کی ہیں۔اب کے وہ بُری طرح گھبرا گئی۔واقعی یہ تو آسمان سے اتری کوئی حور یا پری لگ رہی ہیں۔ان کی تعریف وتوصیف نے ضرار کا سیروں خون بڑھا دیا اور اس طرح دو الگ الگ دنیاوں سے تعلق رکھنے والے دو افراد اس دن ایک ہوگئے۔اب وہ باقاعدہ طور پہ ضرار کی بیوی بن چکی تھی۔وہ بنت البحر تھی مگر اَب اسے انسانوں کی دنیا میں ایک انسان کے ساتھ رہنا تھا جس کی خاطر وہ اپنا سب کچھ داؤ پہ لگا آئی تھی۔

گھر بہت بڑا تھا اور سارا خالی تھا۔ایک دو کمروں میں ہی ضرورت کی کچھ اشیا پڑی تھیں۔وہ دو ہی دن اس کے ساتھ رہنے کے بعد اسے تنہا چھوڑ کے کہیں چلا گیا کیوں کہ اسے اپنا پراجیکٹ ختم کر کے واپس جانا تھا اور ارادہ یہی تھا کہ پہلے اکیلا گھر جائے گا اور پھر اپنی شادی سے متعلق کچھ بتائے گا۔گھر سے نکلا تو یہی سوچ کر تھا کہ شام تک واپس آجائے گا مگر واپسی ممکن نہ ہوسکی۔جل پری کے بارے میں سوچ کے پریشانی ضرور ہوئی کہ اسے ابھی اکیلے چھوڑ کے نہیں آنا چاہیے تھا لیکن مجبوری ایسی آن پڑی کہ دو دن رہنا پڑ گیا۔

اس کے جانے کے بعد بنت البحر پہلے تو اس کے انتظار میں بیٹھی رہی۔پھر جب بھوک نے ستایا... چاروں اطراف نظر دوڑائی تو کچن میں کھانے پینے کا کچھ سامان مل گیا۔اس کے سامنے ضرار نے ایک دو مرتبہ کھانا بنایا تھا مگر وہ چیزوں کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔اسے کچھ پسند نہ آیا۔وہ بددلی سے اپنے بنائے کھانے کو دیکھ رہی تھی۔بس دل پہ جبر کر کے زہر مار کیا اسے سمندری کھانا اور شجر لحم یاد آرہے تھے۔وہ پہلی ہی سیڑھی پہ ڈگمگا گئی تھی جب اسے

ایک اور مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ دن ڈھل چکا تھا اور شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ پورے گھر کو اندھیرے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ شدید وحشت کا شکار ہو گئی۔ ایک تو گھٹا ٹوپ اندھیرا اس پہ تنہائی، اس نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند کر لیا۔ شکر ہے کہ اس نے دن میں کچھ نہ کچھ کھا لیا تھا ورنہ اور بھی مصیبت ہوتی۔ اسے رنگیلی مچھلیاں اور دوست کچھوے یاد آنے لگے وہ اندھیرے میں انھیں پکار رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہہ نکلی۔ رات کاٹنی ایک عذاب تھی۔ وہ اپنے سمندری دوستوں کو پکارتے پکارتے پتا نہیں کب سو گئی۔ خواب میں وہ جل محل میں موجود اپنے بستر پہ محو دراز تھی اور رنگیلی مچھلیاں اسے گیت سنا رہی تھیں۔ سمندری لوری نے جلد ہی اسے نیند کی وادی میں پہنچا دیا۔ آخر کار صُبح ہو ہی گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو یکدم اُٹھ کے اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے آپ کو ایک بار پھر اجنبی دیس میں پایا۔ دل دُکھ سے بھر گیا۔ بے اختیار دل میں دبی خواہش اُبھری کہ کاش یہ حسین خواب کبھی نہ ٹوٹتا۔ وہ اپنا محاسبہ کرنے لگی کہ شاید وہ اپنے فیصلے پہ پچھتا رہی ہے لیکن وہ اپنے آپ سے بھی یہ اقرار نہ کر سکی کہ واپسی کے راستے تو مسدود ہو چکے تھے اور کشتیاں جل چکی تھیں۔

اگلے دن بھی اس نے دن میں ہی سب کام نبٹا کر سر شام اپنے آپ کو کمرے میں بند کر دیا۔ تیسرے دن وہ شام کو گھر پہنچا اور ارد گرد پھیلے اندھیرے دیکھ کر خوب شرمندہ ہوا۔ ارد گرد روشنی کی تو وہ ایک کمرے میں بند ملی۔ ضرار کو دیکھتے ہی اس کا ضبط ٹوٹ گیا۔ وہ رو رہی تھی اس نے بڑی مشکل سے اسے چپ کروایا۔ وہ اسے سمندری مخلوق سمجھ کر بز دلی کا طعنہ دے رہا تھا۔ وہ اس سے ناراض ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے اسے روشنی لگانے کا طریقہ سمجھایا جو نئی عمارت ہونے کی وجہ سے ابھی پوری طرح سیٹنگ میں نہیں آئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ اسے منانے میں کامیاب ہو گیا اور وہ اسے اپنے بنائے عجیب وغریب کھانے دکھانے لگی۔ وہ دل کھول کے ہنسا۔ وہ رات شاید اس کی زندگی کی حسین ترین راتوں میں سے ایک تھی جب باہر

دالان میں پڑے جھولے پہ بیٹھے وہ آسمان پہ پھیلے تاروں کو دیکھتے رہے لیکن اب وہ اس کے سمندری گیتوں کو بے طرح یاد کر رہا تھا۔ وہ بھی اس کی بات سُن کر ایک ایسے کرب سے گزر رہی تھی جو دل میں درد بن کے گڑ گیا۔ سینے میں اٹکے گیت دل میں دفن ہو چکے تھے۔ وہ رات جس کا آغاز خوشی سے ہوا تھا سپیدہ سحر نمودار ہونے تک دُکھ درد کی سوغات بھی اس میں شامل ہو گئی تھی۔ ضرار بھی اُٹھ کے کمرے میں جا چکا تھا۔ اس کے دل میں پہلی بار احساس جاگا کہ کیا وہ ساری عمر ایک ایسی آدھی ادھوری عورت کے ساتھ گزارے گا جو گونگی خاموشی سے اس کا استقبال کیا کرے گی۔ اس کے کان ساری عمر سندر آواز کی مدھرتا کو ترسیں گے۔ وہ خود سے یہ اقرار نہ کر پایا کہ اسے اپنے فیصلے پر پچھتاوہ ہو رہا ہے کیوں کہ اسے اندازہ تھا کہ اپنے فیصلے پر پچھتانے والے زیادہ دیر اس فیصلے پر ٹک نہیں پاتے۔

پھر اس کا معمول بن گیا۔ وہ ایک دو دن ادھر رہ کر پھر کہیں غائب ہو جاتا اور کئی کئی دن اس کا کچھ پتا نہ ہوتا۔ وہ جو انسانی دنیا میں انسانوں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی اسے شدید بے چینی اور مایوسی نے آ گھیرا تھا۔ اب وہ کبھی کبھار اسے گھر سے باہر بھی لے جاتا اور لوگوں سے میل جول بھی بڑھا تو اس نے انسانی دنیا کے باشندوں کے چہرے، رویے اور مزاج بھی سمجھنے شروع کیے۔ وہ گھر سے باہر جانے سے قبل سر پہ آدم زاد کی لائی ہوئی خوب صورت سی ٹوپی پہن لیتی تا کہ ماتھے میں پیوست پیدائشی مور پنکھ دیکھ کر کوئی سوال نہ کر سکے۔ اب اسے اکیلے گھر میں رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا تھا۔ وہ جل پری سے بنت البحر بن چکی تھی مگر ہر رات سپنوں میں جل محل اسے بلاتا تھا۔

''جل پری'' (حصّہ 11)

بنت البحراب رفتہ رفتہ انسانی دنیا کی عادی ہونے لگی تھی۔اس دوران ضرار کا اپنے گھر آنا جانا لگا رہا۔ہشام صاحب کا خیال تھا کہ اب اسے پراجیکٹ ختم ہونے کے بعد واپس گھر آجانا چاہیے۔وہ کمپنی جس کے ساتھ ان کا ایگریمنٹ ہوا تھا۔اس کے کام سے بہت خوش تھی اور ان کے تعریفی جملے اس کے باپ کا سیروں خون بڑھا گئے۔وہ بیٹا جس کی تعلیم و تربیت اور پرورش بیوی کی وفات کے بعد ان کے لیے ایک امتحان بن گئی تھی۔اس سے چھوٹے دونوں بیٹے مکمل توجہ اور اعلیٰ اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اس اہل نہ بن سکے کہ ان کے پھیلے ہوئے کاروبار میں ہاتھ بٹا سکیں۔وہ بیٹا جسے کل وہ دوسری شادی کے بعد ایک بوجھ سمجھنے لگ گئے تھے۔آج ان کا دایاں بازو بن کے کھڑا تھا۔

آج وہ کافی عرصے بعد گھر آرہا تھا۔سوتیلی ماں دُردانہ بیگم، جس کا سلوک شروع میں ناقابل برداشت تھا اب اس کو بھی سمجھ پڑ گئی تھی کہ اپنے دونوں بیٹے تو بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے

کسی قابل نہ بن سکے اور اسے ہر وقت کا خدشہ کہ سوتیلا بیٹا جس نے باپ کی تمام ذمہ داریاں اگر پوری نہیں تو آدھی سے زیادہ بانٹ لیں تھیں۔ دل میں ایک خوف بیٹھ گیا کہ کہیں ساری جائیداد اور مال و دولت ضرار کے ہاتھ ہی نہ آجائے۔ لالچ و ہوس نے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ یکا یک ہی کرلیا۔ وہ اپنی بھانجی الوینہ کو کال ملارہی تھی۔

فون الوینہ نے ہی اُٹھایا۔ ہیلو آنٹی! کیا ماما سے بات کرنی ہے اس نے مصروفیت کے عالم میں جلدی سے آواز لگائی۔ ارے رکو تو، جلدی کس بات کی ہے تمہیں۔ میں نے تم سے ہی بات کرنی ہے اور وہ بیس منٹ تک ہاں، ہوں، ایسے نہیں، ٹھیک ہے کہہ کر سر ہلاتی رہی۔ اوکے آنٹی شام تک میں پہنچ جاتی ہوں اور ساتھ ہی ماما اور حارث کو بتا بھی دیتی ہوں کہ اب میں ایک ماہ ادھر ہی گزاروں گی۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی تھی۔ دُردانہ بیگم اپنے پھینکے ہوئے پتے سے ساری بازی جیتنے کی تیاری کرنے لگی اور اسے معلوم تھا کہ آگے اسے کیا کرنا ہے۔

ہشام صاحب اپنا پراجیکٹ کامیابی سے مکمل ہونے کی خوشی میں جو تقریب منعقد کرنا چاہ رہے تھے اس کا چیف گیسٹ کوئی اور نہیں بلکہ ان کا بیٹا ضرار بن ہشام تھا اور اس وقت ان کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب دُردانہ بیگم نے اپنی بھانجی الوینہ کے رشتے کی بات کی۔ پہلے تو ہشام صاحب نے عینک کے اُوپر سے حیران ہو کر دُردانہ بیگم کو دیکھا۔ کیا تم اپنے ضرار کی بات کر رہی ہو، انھیں جیسے اپنے کانوں پہ یقین نہ آیا۔ بچپن سے ہی اس کو گھر سے دُور رکھنے، ہاسٹل میں ڈلوانے پر مجبور کرنے والی آج ان کے آگے اسی کے لیے اپنی فارن پلٹ بھانجی کا رشتہ پیش کر رہی تھی لیکن پھر پرسوچ انداز میں انھوں نے بیوی کی طرف دیکھا۔ بات تو پتے کی تھی، کیوں کہ دوسرے دونوں بیٹے ناکارہ نکلے، ماں کے بے جا لاڈ پیار اور غلط تربیت کی وجہ سے سوائے ان کی جمع پونجی کو اُڑانے کے کوئی کام نہ تھا۔ اس پہ اگر کوئی باہر کی

لڑکی آجائے، یا ضرار اپنی مرضی سے کوئی لے آئے تو وہ یقیناً اسے ان سے الگ کرنے کی کوشش کرے گی اور اگر وہ اسے جائیداد وغیرہ سے عاق بھی کر دیتے تو بڑھاپے میں ان کے بزنس اور مالی معاملات کو کون سنبھالے گا۔ وہ سوچتے سوچتے... بہت دُور کی کوڑی لائے تھے۔ واقعی اس سے بہتر حل نہیں تھا اس مسئلے کا۔ وہ جھٹ سے تیار ہو گئے اور پھر جلدی جلدی اِدھر اُدھر فون کر کے مختلف ہدایات جاری کرنے لگے۔ دُردانہ بیگم بھی بھاگ دوڑ میں مصروف تھیں۔ گھر کی جلدی جلدی صفائی ستھرائی اور آرائش و زیبائش بھی کی جانے لگی کیوں کہ شام کو کامیابی کے جشن کے علاوہ ضرار کی منگنی کی تقریب بھی تھی۔

پورے گھر کو بہت خوب صورت انداز سے سجایا گیا تھا۔ برقی قمقمے اور رنگ برنگی روشنیوں نے عجیب سا سماں پیدا کر دیا تھا۔ مہمانوں کی بھی آمد و رفت وقفے وقفے سے جاری تھی۔ ضرار بھی آن پہنچا تھا لیکن ابھی اس کو سرپرائز دینے کے چکر میں سب چھپایا گیا۔ وہ گھر کی آرائش و زیبائش دیکھ کے پہلے تو حیران ہوا... مزید ششدر اس وقت ہوا، جب اپنی سوتیلی ماں کا بدلا ہوا رویہ دیکھا۔ لہجے میں گھلی چاشنی، پیار محبت سے واری جاتی، بلائیں لیتی اور بار بار اس کی ایک ایک بات کا خیال رکھتی اسے عجیب سا کھل رہی تھی لیکن وہ حسب عادت خاموش رہا البتہ اس کے اپنے لاڈلے نے محسوس کر کے فوراً ٹوکا! ہائے ممی... طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔ اس کی جانب دیکھ کر وہ دونوں بھائی زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ ضرار کو عجیب سی سبکی محسوس ہوئی اور دُردانہ بیگم چور سی بن گئیں۔ باپ کی آمد نے قصّہ سنبھال لیا۔ ایک طرف کو سٹیج بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا جس پہ دو شاہانہ صوفے رکھے تھے۔ اسے عام سے گھریلو، سادہ لباس میں دیکھ کر ہشام صاحب نے فوراً ٹوکا، یہ کیا...؟ تم نے کپڑے نہیں بدلے ابھی تک۔ جاؤ جا کے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ وہ اُٹھ کے کمرے میں جانے لگا تو پیچھے سے آواز لگائی، تمہارے لیے نیا سوٹ بنوا کے رکھا ہے۔ وہی پہن کے آنا۔ اس نے چپ چاپ سر ہلا

دیا، بچپن کی محرومیوں نے اسے نہ کہنا سکھایا ہی نہیں تھا۔

خوب صورت سیاہ تھری پیس سوٹ دیکھ کر وہ پہلے چونکا تو ضرور، مگر باپ کا کہا من وعن تسلیم کرنے کی عادت نے کبھی کسی بات پر اعتراض یا انکار کرنا تو درکنار ان کے سامنے سر ہی اُٹھانے نہ دیا۔ وہ اس سے قبل ایسے کبھی تیار نہ ہوا تھا۔ تیاری کے بعد قد آدم آئینے میں اپنا آپ دیکھ کر عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ زیادہ تر خود سے بے پرواہ ہی رہتا تھا لیکن آج اس کی تیاری دیکھ کے پہلے دُردانہ بیگم، اس کے سوتیلے بھائی اور پھر ہشام صاحب حیران ہوئے تھے۔ اچانک ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ انجانے میں اپنے اس بیٹے کے ساتھ بہت بُرا سلوک کر گئے تھے۔ اپنے سے دُور رکھا اور کام ہی لیتے رہے لیکن اب انھوں نے سوچ لیا تھا کہ اس کے سب دُکھوں کا ازالہ کریں گے۔

ہال میں اتنی زیادہ رش نہیں تھی۔ چیدہ چیدہ مہمان بلائے گئے تھے۔ الوینہ کا اس سے آمنا سامنا ہو چکا تھا اور وہ وقفے وقفے سے اسی کے ارد گرد گھوم رہی تھی۔ کھانے پینے کی انواع واقسام اشیاء ساتھ ساتھ ہی پیش کی جا رہی تھیں۔ پس منظر میں چلتی موسیقی کی آواز ماحول کو مزید خوب صورت بنا رہی تھی۔ اچانک اسے سٹیج پہ بلوایا گیا۔ وہ سمجھا کہ شاید فوٹو سیشن کے لیے بلا رہے ہیں۔ اس کے سٹیج پر پہنچتے ہی ہشام صاحب نے مائک تھام لیا۔ آج میں اپنے بیٹے ضرار کے ساتھ بھانجی الوینہ رضا کے نکاح کا اعلان کرتا ہوں۔ امید ہے کہ جلد ہی یہ شادی کے مقدس بندھن میں بھی بندھ جائیں گے۔ وہ اچانک پڑنے والی اس اُفتاد سے اس وقت سنبھلا، جب نکاح خواں اس سے پوچھ کے دونوں کو رشتہ ازدواج میں باندھ چکا تھا۔ وہ ساری رسومات کے دوران بت بنا باپ کے ہر حکم پہ سر جھکا تا رہا۔ پھر وہ لمحہ بھی آیا جب اس کے مضبوط ہاتھ میں الوینہ کا ہاتھ دے دیا گیا اسے دُور کہیں جل پری کھڑی دکھائی دی۔ اس نے گھبرا کے الوینہ کا ہاتھ جھٹک دیا۔ کسی اور کی نظر نہ پڑی ہو مگر الوینہ کو نہایت سبکی محسوس ہوئی۔

اسے اس رشتے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن آنٹی نے جب اسے مستقبل کے سبز باغ دکھائے تو وہ فوراً تیار ہو گئی لیکن اسے ضرار کا یہ ہتک آمیز رویہ ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ ہشام صاحب نے تحکمانہ انداز میں ڈائمنڈ کی انگوٹھی ضرار کے ہاتھ میں دی اس نے کسی معمول کی طرح فرمانبرداری سے الوینہ کی اُنگلی میں پہنا دی۔ ہال تالیوں کی آواز سے گونج اُٹھا۔ وہ گھبرا کر اسٹیج سے اُتر آیا۔ رات گئے تک محفل چلتی رہی۔ سب کے بہت مجبور کرنے پہ بھی وہ دوبارہ ہال میں نہ گیا اور دیگر مہمانوں کے ساتھ ہی رہا۔ ہشام صاحب اس کے رویے کو نارمل لے رہے تھے۔ اچانک ہو جانے والے فیصلے کے ردِّعمل کے طور پر اگر وہ ایسا رویہ دکھا رہا تھا تو انھیں اُمید تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اسے سمجھا دیں گے کہ اس کے مستقبل کے لیے کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ وہ پارٹی ختم ہونے کے بعد دُردانہ بیگم کے شکوہ کرنے پر، اس سے زیادہ اپنے آپ کو تسلی دے رہے تھے۔

''جل پری'' (حصّہ 12)

انسانی دنیا میں قدم رکھتے ہی بنت البحر کو اندازہ ہوگیا کہ یہ سمندری دنیا سے بے حد مختلف ہے اور سب سے عجیب بات یہ تھی کہ سمندر میں انواع و اقسام سمندری مخلوق تھی کسی کے دو پر، تو کسی کے چار، کسی کے پانچ ہاتھ اور کوئی صرف ایک آنکھ والا لیکن اس کے باوجود بھی سب بے حد اتفاق اور محبت سے رہتے تھے۔ جل کے کچھ اُصول اور ضابطے تھے جن کی پابندی ہر چھوٹے بڑے کو کرنی پڑتی تھی اور حکم عدولی یا زیادتی کرنے والے کو جل بدر کر دیا جاتا تھا مگر انسانی دنیا کے باشندے بہت عجیب تھے۔ ایک طرح کے قد و قامت، ڈیل ڈول اور وضع قطع ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے برسرِ پیکار، جھوٹے، دغا باز اور کینہ پرور ہر وقت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور ایک دوسرے پہ سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف اور روپے پیسے کی ریل پیل ہونے کے باوجود لالچ، ہوس، خود غرضی اور انتہا درجے کی مطلب پرستی تھی اور اسے اندازہ ہوگیا کہ نہ صرف انسانی دنیا بلکہ آدم زاد بھی ویسا ہی

تھا... پہلے پہلے وہ اسے اپنا وہم سمجھتی رہی مگر جلد ہی اس کا شک یقین میں بدل گیا۔انسان ہے ہی ابن الوقت، اپنا مطلب نکلتے ہی دوسرے انسان کوکسی فالتو اور بے کار چیز کی طرح پھینک دینے میں ایک پل بھی نہیں لگا تا۔وقت بہت آگے سرک آیا تھا۔ضرار کی سنگت میں پیار بھری زندگی گذارنے کی جوخواہش لے کروہ اپنا سب کچھ تاوان کرآئی تھی وہ بہت جلد ایک پچھتاوہ بن گیااور یہ پچھتاوہ ہرآنے والے دن ایک نئی کسک بن کراس کے دل کو سلگا تا تھا۔

یہ نہیں تھا کہ اس کے دل میں ضرار کی محبت کم ہوگئی تھی لیکن یہ ضرور سچ تھا کہ ضرار کے دل میں اس کی محبت کے رنگ پھیکے پڑ چکے تھے۔اپنے پیار کو پانے کی پاداش میں وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھی تھی۔اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ زیادہ دیر یہاں ٹک نہیں پائے گی۔اسے انسانی دنیا میں چلنا نہیں آسکا تھا۔وہ یہاں کے جھوٹ، دھوکے اورفریب سے مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔وہ چلتے چلتے تھک گئی تھی۔اگرہمراہ چلتا شخص اس کی قربانیوں کوسمجھتا تو وہ بہت خوشی سے رہ لیتی مگراس کی سُست چال اورزباں پہ لگے قفل سے وہ اُکتا گیا تھا۔کبھی وہ اس کے میٹھے سروں کا دیوانہ ہوا کرتا تھا مگر اَب تو وہ یہ سر بھی کھو چکی تھی۔وہ جہاں کہیں پانی دیکھتی پانی کی لہریں اسے اپنی طرف کھینچتیں اوراسے لگتا کہ جل واسی اسے واپس بلارہے ہیں پھر وہ کئی کئی دن بے چین رہتی اوراسے دن بدن محسوس ہونے لگ گیا تھا کہ ضراراس سے اُکتانے لگ گیا ہے اس کی جیب میں پڑے محبت کے سب سکے واقعی کھوٹے نکلے۔ایسا لگتا تھا کہ ضرار کا دل اس سے اوب گیا ہے،اب اکثر جب وہ آتا،تواس کے ساتھ کوئی اورآدم زادی بھی ہوتی...اسے انسانی دنیا کے کھانے بنانے بھی آگئے تھے۔شروع کے کچھ دنوں میں اسے آدم زاد نے سکھائے تھے۔وہ خاموشی کے ساتھ کھانا بنا کرانھیں دے آتی کہ زبان بندی تو شاید قدرت نے یہاں آنے سے پہلے اسے عنایت کردی تھی...اسے پتا نہیں تھا کہ وہ

اس کی کون تھی اور یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس عورت کو آدم زاد نے اس کے بارے میں کیا بتایا تھا لیکن اس پہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ اس کا وجود اپنی تمام تر خاموشی اور بے نیازی کے باوجود اس عورت کی آنکھوں میں بُری طرح کھٹکتا تھا۔ وہ جب کھانا بنا کر انھیں دینے جاتی تو ناگواری کی ایک سرد لہر اس عورت کے چہرے پر دوڑ جاتی۔ پتا نہیں وہ عورت اس کے اور آدم زاد کے درمیان اب آ گئی تھی یا پہلے سے اس کی زندگی میں کہیں موجود تھی لیکن یہ ضرور تھا کہ اب اس کی حیثیت گھر میں پڑے فالتو کاٹھ کباڑ سے بھی بدتر تھی۔

نکاح والے دن ہی الوینہ نے ٹھان لیا تھا کہ خواہ کچھ بھی کرنا پڑے اسے ہر قیمت پہ ضرار کا دل جیتنا ہے۔ نکاح والے دن تو ضرار دو دن گھر رکنے کے بعد کسی ایمرجنسی کا کہہ کے گھر سے چلا گیا لیکن ہشام صاحب نے اس پہ پابندی لگا دی کہ جلد از جلد پراجیکٹ ختم کر کے یہیں شفٹ ہو جائے۔ اس دوران اسے مکمل چھوٹ دینے کے بجائے یہاں کے آفس کا بھی بے تحاشا کام سونپ دیا۔ جس کی وجہ سے وہ بمشکل پراجیکٹ کے کام نبٹا کے فوراً یہاں آجاتا۔ اس طرح الوینہ کو اس کے قریب آنے اور توجہ حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔

آفس کے کام سے پانچ دن کے لیے سکردو کا ٹرپ تھا جس میں دو بڑی غیر ملکی کمپنیاں بھی شامل تھیں۔ ہر کمپنی اپنے ساتھ دو مرد اور ایک خاتون ممبر بطور نمائندہ لے کے جانے کی پابند تھی۔ ضرار نے پہلے سوچا کہ بنت البحر کو ساتھ لے کر جائے لیکن والد نے الوینہ کو ساتھ لے جانے کو کہا کیوں کہ وہ بھی آفس کے کاموں میں کافی مدد کرتی تھی۔ ضرار نے بہت سوچا... الوینہ اور بنت البحر... نہیں نہیں... بنت البحر کسی صورت بھی اس کے ساتھ کسی سرکاری میٹنگ یا بزنس فنکشنز میں جانے کے قابل نہیں۔ پہلے تو اسے اتنے بڑے اور پڑھے لکھے لوگوں میں طریقے سے چلنا ہی نہیں آئے گا۔ ایسے ہی لوگوں کو دیکھ کے گھبراتی رہے گی۔ دوسرا یہاں آ کے کچھ نہ کچھ بولنا پڑے گا۔ مختلف موضوعات پہ لوگوں سے بات چیت کرنی ہو گی لیکن وہ تو

بولنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی تھی۔تیسری مصیبت اس کے ماتھے پہ پیوست پر تھے۔جن کو مختلف کیپس کے نیچے چھپاتے چھپاتے وہ تھک چکا تھا اور اسے ہر لمحے یہ راز فاش ہو جانے کا دھڑ کا لگا رہتا تھا۔

انہی باتوں کو سوچتے سوچتے ،قرعہ فال الوینہ کے نام نکلا۔اس دن الوینہ کی خوشی دیدنی تھی جب اسے پتا چلا کہ وہ ضرار کے ساتھ سکر دو جا رہی ہے۔وہ کافی عرصے سے اس کا جھکاؤ اپنی طرف ہوتے دیکھ چکی تھی اور آنٹی دُردانہ کو اپنی کامیابی کے قصّے سنا رہی تھی۔اسے کچھ عرصہ قبل بنت البحر کے بارے میں بھی پتا چل گیا تھا۔جب اس نے ضرار کے موبائل میں اس کی تصویریں دیکھیں تھیں لیکن دُردانہ آنٹی کے سمجھانے پہ چپ کی چادر اوڑھ لی تھی اور ایک دن موقع پا کے ضرار سے دوستانہ انداز میں سب کچھ اگلوا لیا۔ضرار نے سوائے اس کے جل پری ہونے کے باقی سب گوش گزار کر دیا کہ وہ اسے ایک حادثے میں ملی اور مجبوراً اس سے نکاح کرنا پڑا کیوں کہ اس کے والدین مر چکے ہیں۔آنٹی دُردانہ اور الوینہ نے اسے باپ کو کچھ بھی بتانے سے منع کر دیا اور اس کے اس کمزور پہلو سے خوب فائدہ اُٹھایا۔اب تو الوینہ ضرار کے ساتھ اس کے اس گھر میں بھی جاتی تھی ،جہاں بنت البحر رہتی تھی۔الوینہ جب بھی وہاں جاتی۔بنت البحر اپنے کمرے سے باہر نہ آتی اور اس وقت نکلتی ،جب کھانے کا وقت ہوتا۔وہ کھانا بنا کے جس خاموشی سے آتی ،ویسے ہی واپس چلی جاتی۔

ضرار نے اگرچہ کے اسے بتا دیا تھا کہ وہ پیدائشی طور پہ گونگی ہے لیکن اس کی آنکھیں بولتی تھیں۔کالی گہری آنکھیں۔اسے ان سے عجیب سا خوف محسوس ہوتا۔اسے دیکھتے ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔پھر ایک دن وہ بھی آیا جب آنٹی دُردانہ نے اسے کہا کہ وہ بنت البحر کو طلاق دے دے۔ورنہ وہ الوینہ کو چھوڑ دے۔وہ اضطراری کیفیت سے انھیں دیکھنے لگا۔! آنٹی...یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔میں بنت البحر کو چھوڑ دوں تو وہ کہاں جائے

گی۔اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور سب سے بڑی بات کہ وہ میری خاطر...اس نے کچھ کہتے کہتے زبان دانتوں میں داب لی۔ٹھیک ہے کہ وہ بنت البحر سے پوری طرح اُکتا گیا تھا۔اس کی محبت دل کے کسی کونے میں پُرانے بے کار سامان کی طرح رکھ چھوڑی تھی بلکہ کسی وقت تو وہ اسے اپنی زندگی پر بوجھ ہی لگتی تھی۔اس کے باوجود اس نے کسی لمحے بھی اسے چھوڑ دینے یا اس سے چھٹکارا پانے کے بارے میں نہیں سوچا تھا اور آج اس کی ہونے والی بیوی اور سوتیلی ماں اسے ایک نئی راہ دکھا رہی تھی کہ اگر وہ بنت البحر کو چھوڑ بھی دیتا ہے تو اسے اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ الوینہ کا بھائی ہیپی بنت البحر پہ بُری طرح فدا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔یہ سُن کر اس کا خون بُری طرح کھول اُٹھا۔آنٹی نے اسے دو دن کا وقت دیا تھا۔

الوینہ کا بھائی ہیپی ماڈلنگ کرتا تھا اور اوباش قسم کا لڑکا تھا۔اسی نے ضرار کے فون میں ایک بار بنت البحر کی مختلف تصاویر دیکھی تھیں اور بعض تصویریں اس وقت کی بھی تھیں جب وہ جل پری تھی۔وہ اس کا حسن و جمال اور سمندری روپ دیکھ کر حیران رہ گیا۔مختلف تصاویر کے ساتھ ساتھ کہیں جل پری اور کہیں بنت البحر کا کیپشن دیا گیا تھا۔وہ اسے فوٹو شاپ اور ایڈیٹنگ کا کمال سمجھا۔جب اسے الوینہ سے پتا چلا کہ وہ تو ضرار کی بیوی ہے تو شاکڈ رہ گیا اور اسی کے بنائے گئے پلان کے تحت آنٹی دُردانہ اور الوینہ ضرار کے سامنے دھمکی کارڈ استعمال کر رہی تھیں۔اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جاتے۔نہ صرف بنت البحر سے نجات پانے کے بعد ضرار اور اس کی ساری دولت کی اکیلی مالک بن جاتیں بلکہ ضرار ساری عمران کے سامنے راز فاش ہونے کے ڈر سے دبا رہتا۔اس کے علاوہ ہیپی کی تو لاٹری لگ جاتی۔وہ کب سے اپنی ماڈلنگ کمپنی کے لیے کوئی نیا اور یونیک چہرہ ڈھونڈ رہا تھا جو اسے جلد ہی ملنے والا تھا۔

گھپ اندھیرے میں جلتے بجھتے لائٹر کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی سرگرم عمل تھا۔

آج وہ بہت دن بعد بنت البحر کے ساتھ اس کے گھر پہ تھا۔آنے والے کچھ ہی روز میں اس کی اور الوینہ کی شادی طے تھی اور اس دوران ہی یہ ساری حقیقت سوائے اس کے باپ کے سب کے سامنے آ گئی۔وہ بیچ منجدھار کے پھنسا تھا۔کوئی سمت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔اگر بنت البحر کا ساتھ ہی اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو ایک ہی پَل میں آسمان سے زمین پر آجائے گا۔اس کے پَل پَل کی محنت اور ساری عمر کی تگ و دو کے نتیجے میں پھل کھانے کا وقت آیا تو سب مال و دولت اور جائیداد دوسرے ہتھیالیں گے اور اس کے پاس رہ جائے گی ایک گونگی، جاہل اَن پڑھ لڑکی جسے وہ ناحق سمندر کی تہہ سے اُٹھالایا تھا جو اب اس کے گلے پڑی ایسی مصیبت کی طرح تھی جسے وہ ہر قیمت اتار پھینکنا چاہتا تھا۔

''جل پری'' (حصّہ 13)

بنت البحر اور اس کا چند دن قبل شدید جھگڑا ہوا تھا۔ وہ اسے ہیپی کے ساتھ جانے کے لیے کہہ رہا تھا تاکہ وہ اسے ایک کمرشل میں بطور ماڈل سامنے لانے کے لیے ٹریننگ دے سکے کیوں کہ اس شعبے میں حسن و خوب صورتی ہی کافی نہیں تھی اسے ابھی بہت زیادہ گرومنگ کی ضرورت تھی۔ ہیپی نے اس کے سامنے ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس کی گندی نظریں بنت البحر کے جسم سے آر پار ہو رہی تھیں۔ اس نے بُری طرح اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ہیپی اپنی بے عزتی پہ سخت تاؤ میں آ گیا اور دل میں ٹھان لی کہ ہر قیمت پہ اسے حاصل کرنا ہے۔

کچھ دن قبل آنٹی دُردانہ نے ضرار سے کہا تھا کہ وہ اسے گھر لے کے آیا کرے تاکہ وہ ان لوگوں میں ایڈجسٹ ہو سکے اور اٹھنا بیٹھنا سیکھ سکے۔ پہلے تو الوینہ نے بہت برا منایا۔ آنٹی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں وہ گنوار عورت مجھ سے وہاں برداشت نہیں ہوتی تو آپ اسے یہاں بلا رہی ہیں تاکہ وہ ضرار کے ساتھ ساتھ رہے اور میرا دل جلاتی رہے۔ ارے لڑکی! پاگل مت بنو میں اسے یہاں ضرار کی وجہ سے نہیں بلکہ ہیپی کی وجہ سے بلوا رہی ہوں تاکہ وہ اسے اپنی طرف مائل کر سکے۔ الوینہ بات سمجھ کے چپ ہو رہی۔ آنٹی دُردانہ کے اصرار پر وہ اس مرتبہ

آتے ہوئے، بنت البحر کو ساتھ لے کر آیا تھا کیوں کہ ہشام صاحب دو ہفتے کے لیے ملک سے باہر گئے تھے۔ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ دیکھو! تمہیں اپنے گھر اس لیے لے کر جا رہا ہوں تا کہ تم ان لوگوں میں رہنا سیکھ لو اور یہی تو تم چاہتی تھی نا... انسانی دنیا میں... انسانوں کے ساتھ رہنا۔ اب جب تمہیں موقع مل رہا ہے تو تم ناخوش ہو۔ اس نے انکار میں گردن ہلائی اور اس کے ہاتھ تھام کے اپنے ہاتھ پہ رکھ دیے جس کا مطلب تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ وہ بات سمجھ کے انجان بن گیا۔

ضروری سامان کے ساتھ وہ لوگ گھر پہنچ چکے تھے۔ الوینہ گھر پہ نہیں تھی۔ ضرار کے پوچھنے پہ پتا چلا کہ وہ بیوٹی پارلر گئی ہے صبح سے۔ دُردانہ بیگم حیران تھیں کہ وہ ایک ان پڑھ، گنوار، گونگی لڑکی سے کیوں اتنی پریشان ہے مگر جیسے ہی ان کی نگاہ اس کی طرف اُٹھی... تو دیکھتی ہی رہ گئیں۔ اس قدر حسن شاید ہی کہیں دیکھا ہو۔ سر پہ مضبوطی سے جمی شاندار سی کیپ... اس کی ذات کا حصّہ ہی معلوم ہوتی۔ واقعی یہ تو اس زمین کی لگتی ہی نہیں۔ کوئی اپسرا... پری... یا کوئی حور... جو راستہ بھٹک کے دنیا میں آ نکلی ہو۔ کون ایسا ہو گا جو اس کے طلسم سے بچ سکے۔ انھیں اس کے ملکوتی حسن سے شدید خوف محسوس ہوا۔ الوینہ سچ ہی کہتی تھی کہ یہ لڑکی ان کے مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے اس لڑکی سے جان چھڑانی چاہیے۔ انھوں نے خود کلامی کی۔

اسے ملازمہ کے حوالے کیا کہ اس کے کمرے میں چھوڑ آئے۔ پر سوچ انداز میں بیٹھی تھیں کہ پپی آتا دکھائی دیا۔ کیوں ڈیئر آنٹ! مبہوت ہو گئیں نا اس کا حسن و جمال دیکھ کے۔ انھوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب دیکھتی جائیں کہ پپی کے ہاتھ یہ ہیرا لگتے ہی اسے ٹاپ کلاس ماڈل بنا دوں گا۔ واقعی بات تو دل کو لگتی ہے۔ پتا نہیں کمبخت کہاں سے لائی ہے اتنا حسن۔ نہ دیکھا... نہ سنا۔ انھوں نے کہا۔ ڈونٹ وری آنٹ، جتنی جلدی ہو سکے اس کو موم کرنے

کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ کوئی اور لے اُڑے۔ ویسے بھی ضرار کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پتا نہیں کیا سوچ کے شادی کر لی تھی۔ دولت کی چکا چوند کے آگے حسن کی دولت بھی کھوٹے سکے کی طرح ہوتی ہے۔اب کے دُردانہ آنٹی نے نخوت سے کہا تھا۔

بنت البحر اپنے کمرے میں تھی۔ضرار اسے چھوڑ کے کہیں چلا گیا تھا۔ دُردانہ بیگم بھی الوینہ کا انتظار کرتے کرتے تھک کے اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔اسی موقع کے انتظار میں ہیپی تاک لگائے بیٹھا تھا۔ دُردانہ آنٹی کا ایک بیٹا سنی بھی اتفاق سے گھر پہ ہی تھا۔ ہیپی سب کے کمرے کا جائزہ لے کر اس کمرے کے سامنے کھڑا اندر جانے کو پر تول رہا تھا جہاں جل پری موجود تھی۔ہلکے سے ہاتھ سے دروازہ اندر دھکیلا۔ وہ بے آواز کھلتا گیا۔وہ سامنے پڑے بیڈ پہ نیم دراز تھی۔ہلکی سی آہٹ محسوس ہونے پہ چونک کے دروازے کی سمت دیکھا۔ ہیپی دروازے کے بیچوں بیچ ایستادہ تھا۔ یکدم اس کے کسی ردعمل سے بچنے کے لیے پیچھے مڑ کے دروازے کو کنڈی لگا دی۔وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔وہ ایک جست میں اس تک پہنچ گیا تھا اس کے ناپاک ہاتھ اس کے جسم کو چھو رہے تھے۔اس میں پتا نہیں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی اسے پوری قوت سے دھکا دے کر وہ باہر کی طرف بھاگنے لگی تو اس کی کیپ اُتر گئی۔ہیپی اس کے ماتھے پہ اگے مور پنکھ دیکھ چکا تھا۔اس نے جلدی سے کیپ پہنی اور کنڈی کھول کر باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔زور زور سے دروازے کھلنے، بند کرنے کی آواز سُن کے دُردانہ بیگم باہر آ چکی تھیں۔اتنے میں ہیپی ہانپتا ہوا بکھرے بالوں کے ساتھ بنت البحر کے کمرے سے برآمد ہوا۔ یہ ادھر کیا چل رہا تھا۔وہ صفائی دینے والے انداز میں ہیپی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔جب کہ ہیپی بولا، آنٹی! یہ تو یونہی گھبرا گئی تھی۔میں اسے سکھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے کیسے ایک ایک اسٹیپ لے کے چلنا ہے اور کس طرح بیٹھنا ہے۔ یہ واقعی بہت جاہل اور گنوار ہے۔لے کے دھکا مارا مجھے زور کا۔اگر خود کو نہ سنبھالا

ہوتا تو ابھی سر پھٹ جاتا۔ اتنے میں گاڑی کا ہارن ہوا تھا۔ پھر بڑے سے لاؤنج میں سے ضرار اور الوینہ قدم بہ قدم چلتے دکھائی دیے ہاتھوں میں بڑے بڑے شاپنگ بیگز اور دیگر سامان اُٹھائے۔ وہ ضرار کی کسی بات پہ قہقہہ لگاتے اندر داخل ہوئی تھی۔

بنت البحر اسی لمحے چکرا کے گری تھی۔ ضرار تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ دُردانہ بیگم اور الوینہ نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہوش میں آئی تو خود کو اپنے ہی گھر کے بستر پہ پایا۔ ارد گرد پھیلی تنہائی دیکھ کے اندازہ ہو گیا کہ ضرار اسے چھوڑ کے چلا گیا ہے۔ دُردانہ بیگم کسی بھی طرح ہپی والا واقعہ ضرار کے گوش گزار نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے بہتر یہی سمجھا کہ ضرار کو سمجھا بجھا کے اسے واپس اس کے گھر بھجوا دیں۔ ضرار ان کی زبانی یہ سُن کے کہ وہ یہاں شاید ایڈ جسٹ نہیں ہو پا رہی اور کسی چیز کو دیکھ کے ڈر گئی ہے۔ اسے واپس گھر لے آیا تھا۔ اس کی طبیعت رات تک بہت خراب رہی۔ رات میں وہ واپس گھر آ گیا تھا۔ وہ اسی طرح بے سدھ پڑی رہی۔ وہ اسے اس طرح لیٹے دیکھ کے حیران ضرور ہوا۔ کیا ہوا ہے تمہیں۔ کب سے ایسے پڑی ہو اور تمہیں پتا ہے تمہاری وجہ سے مجھے کتنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ کتنی سبکی محسوس ہوئی جب مجھے دُردانہ آنٹی نے بتایا کہ ہپی تمہیں ماڈلنگ کے انداز سکھانے کی کوشش کر رہا تھا اور تم نے اس پہ حملہ کر دیا۔ سوچو اگر اسے کچھ ہو جاتا تو کون ذمہ دار ہوتا۔ تم گنوار کی گنوار ہی رہو گی ہمیشہ...میں تمہارا کیا کروں اب۔ نہ تم کچھ سیکھنا چاہتی ہو، نہ آگے بڑھ سکتی ہو۔ وہ اس کی طبیعت بھول کر شدید غصّے کی حالت میں باہر نکل گیا۔ وہ صدمے سے رونے لگی۔ اسے بہت عرصے سے اس کے بدلے تیور دکھائی دے رہے تھے۔ اسے الوینہ اور دُردانہ بیگم کی آنکھوں سے جھانکتی نفرت اور ناپسندیدگی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ انسانوں میں رہ کر ان کے گھٹیا چال چلن سے پوری طرح واقف ہو گئی تھی۔ اس کے شوہر کا جان بوجھ کے اسے ہپی کی طرف مائل کرنا، دُردانہ بیگم کے دونوں بیٹوں کے

چہروں سے جھانکتی خباثت اور سب سے بڑھ کر ضرار کی بے اعتنائی... ہر ایک تکلیف اس کے لیے اب برداشت سے باہر تھی۔ ایسے میں امید کی کونپل اس وقت پھوٹی۔ جب اس کی طبیعت خراب ہونے پہ اچانک اسے اُٹھا کے ہسپتال لے جانا پڑا اور آنکھ کھلنے پہ خوشخبری اس کی منتظر تھی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ یہ اس کی خام خیالی ہی تھی کہ ضرار یہ خبر سُن کر خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔ کیا خبر تھی کہ یہ اطلاع اس کے لیے موت کی پیامبر ثابت ہو گی۔

وہ گزشتہ تین گھنٹے سے کمرے میں بند سگریٹ پہ سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ بنت البحر کو ساتھ لے کے چلے مگر وہ ہر قدم پہ اس کے لیے ایک مسئلہ ہی تھی۔ سوچا تھا کہ پپی اگر اسے اپنا لیتا تو وہ بآسانی اسے چھوڑ کے الوینہ کے ساتھ زندگی گزارتا جو ہر طرح سے اس کے ساتھ چلنے کے قابل تھی لیکن وہ اس کے سارے پلان کا ستیاناس کر آئی بلکہ اب پپی نے اس کے مورپنکھ بھی دیکھ لیے تھے جن کے بارے میں وہ بدستور سوال کر رہا تھا اور اَب تو یہ نیا مسئلہ سامنے آ گیا تھا۔ جب اسے اس کی پریگننسی کا پتا چلا تھا۔ اس کا دماغ بہت سی باتیں مختلف زاویوں سے سوچ رہا تھا۔ اگر بنت البحر نے انسان کے بجائے کسی جل پری کو جنم دے دیا تو ساری دنیا کے سامنے اس کے خاندان کا تماشہ بن جائے گا اور پھر وہ اس کو دنیا سے چھپاتا پھرے گا یا سمندر میں بہا دے گا۔ وہ اس وقت خود غرضی کی انتہا پہ پہنچ گیا تھا۔ اسے اس مسئلے کا ایک ہی حل سجھائی دیا اور اسے جلد از جلد اسے انجام دینا تھا۔ کہیں سوچتے سوچتے وقت ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ پھر فیصلہ ہو گیا تھا۔ اس کا دل دماغ ایک نکتے پہ مرکوز ہو چکے تھے۔ اس نے ٹھان لیا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

''جل پری''(حصّہ 14)

وہ ان دنوں بہت خوش تھی۔ضرار کی بے اعتنائی بھی اسے زیادہ تکلیف نہیں دے رہی تھی کیوں کہ اب اس کی آنکھوں میں نئے خواب سجے تھے۔اسے وہ دن یاد آیا جب ان کے جل میں موجود شارک نے بچے دیے تھے۔وہ کس قدر خوش ہوئی تھی۔سارا سارا دن شارک کے بچوں سے کھیلتی رہتی اور آج وہ خود ماں بننے جارہی تھی۔اس کے چہرے پہ عجب سا نور کا ہالہ ہمہ وقت احاطہ کیے رہتا تھا۔

اسے اپنے سمندری دوست بے طرح یاد آرہے تھے۔اگر انھیں اس بارے میں پتا چلتا تو وہ سب کتنا خوش ہوتے اور رنگیلی مچھلیاں تو رقص کر کر کے تھک جاتیں۔کاش کہ وہ ایک بار پھر ان سب سے مل سکے اور اس سمے اسے نہیں معلوم تھا کہ فرشتے اس کی دعا پہ آمین کہہ چکے ہیں۔

رات وہ گھر پہ نہیں تھا۔وہ منہ اندھیرے ہی اُٹھ گئی تھی کہ کسی نے دروازے پہ دستک

دی۔ مخصوص سی آواز ضرار کی ہی تھی۔ وہ بہت جلدی میں گھر آیا تھا۔ جل پری! جلدی سے تیار ہو جاؤ... ہمیں کہیں جانا ہے۔ ضرار گھر میں داخل ہوتے ہی اسے آوازیں دینے لگا۔ وہ اس کے جل پری کہہ کے پکارنے پہ حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی کیوں کہ جب سے اس کا نام بنت البحر رکھا گیا تھا۔ اس کا اصل نام لینا تو وہ بھول ہی گیا تھا۔ وہ اشارے سے پوچھنے لگی کہ! کہاں جانا ہے؟ سوال مت کرو اور جلدی تیار ہو جاؤ۔ اس کے سخت لہجے نے اسے پریشان کر دیا۔ صُبح سویرے پتا نہیں وہ اسے لے کر کہاں جا رہا تھا۔ وہ گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگا کے گہری نیند سو گئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو گاڑی ایک جگہ رکی تھی۔ شاید دن گزرے بھی کافی وقت ہو گیا تھا۔ وہ کتنا سوئی تھی۔ ضرار کھانے کے لیے کچھ لے آیا۔ پھر سڑک کے ذریعے ہی سفر کرتے پورے دو دن بیت گئے تھے۔ ایک دن تو وہ درمیان میں کسی ہوٹل میں رُکے تھے۔ اسی طرح چلتے رکتے نہ جانے انہوں نے کتنے ہی شہر پار کر گئے تھے۔ اسے سفر نے شدید تھکا دیا تھا۔ آخر میں اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ اسے بہت اُداس اور پریشان لگا تھا۔ بہت چپ چپ سا اور بکھرا ہوا، جیسے کسی اضطراری کیفیت سے گزر رہا ہو۔ وہ اس کی طرف بنظر غور دیکھنے لگی۔ اس کی محویت محسوس کر کے وہ گھبرا گیا۔ جیسے کوئی چوری کرتے پکڑا گیا ہو۔

وہ آج پھر ایک ہوٹل پہ رات رکے تھے۔ اگلے دن دوبارہ کسی انجان رستے پہ سفر شروع ہو چکا تھا اور شام کے قریب آخر کار وہ اپنی منزل مقصود پہ پہنچ گئے۔ شہر میں داخل ہونے کے بعد مختلف گنجان آباد راستوں سے ہوتی ہوئی گاڑی ایک جانی پہچانی سی جگہ پر جا کر رُک گئی کیوں کہ آگے کا رستہ پیدل چلنا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر حیران سی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور ان رستوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر وہ تیز قدموں سے سامنے کی طرف چلنے لگی۔ وہ اس جگہ کو پہچان گئی تھی۔ گو کہ ابھی وہ لوگ ساحل سمندر سے بہت دُور تھے لیکن وہ اپنی

مٹّی، اپنی شناخت کہاں بھولی تھی۔ بہت زیادہ چلنے کے بعد اسے ساحل سمندر نظر آ گیا۔اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُڑ کے وہاں پہنچ جائے۔ضرار بھی اس کے ساتھ ساتھ تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔آخر کار وہ دونوں اس پتّھر کے قریب پہنچ گئے جہاں وہ پہلی بار ملے تھے۔ وہ سمندر کو دیکھ کر بے اختیار کسی ماہی بے آب کی طرح مچل رہی تھی۔ سمندر کے پانی میں طوفان برپا ہو گیا۔اسے پانی کی لہریں اپنی طرف بلا رہی تھیں۔جل پری کو دیکھ کر لہروں نے بھی اپنا سر ساحل پہ پٹخنا شروع کر دیا۔وہ اشارے سے ضرار کا شکریہ ادا کر رہی کہ وہ اسے سمندر سے ملوانے کے لیے لایا ہے۔اسے ضرار کی ساری بے اعتنائیاں اس وقت بھول چکی تھیں۔ وہ اسے پتّھر پہ اپنے ساتھ بیٹھنے کا کہہ رہی تھی مگر وہ کٹھور پن سے کنارے لگ کے کھڑا رہا۔ اسے ضرار کا رویہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔اسے کسی انہونی کا احساس ہو رہا تھا۔اس کے دل نے زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔آخر کار ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی لہروں کے شور میں ضرار کی آواز اُبھری۔

”میں تمہیں ہمیشہ کے لیے یہاں چھوڑنے آیا ہوں جل پری اب میں مزید تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔تم میرے ساتھ قدم ملا کے نہیں چل سکتی۔ دو مختلف دنیاؤں کے لوگ کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔اس کی چلتی ہوئی سانسیں گویا تھم سی گئیں۔سارا جسم کان بن گیا۔ کسی وقت یہ آواز اس کے لیے زندگی کا پیغام تھی اور آج یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے پگھلا ہوا سیسہ کسی نے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔ وہ بولے جا رہا تھا۔ جیسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑے مجرم کو سزائے موت سنا دی جاتی ہے۔اس نے ایک ہاتھ سے دھڑکتے دل کو تھامنے کی بے سود کوشش کی۔جس کی دھک دھک سمندر کے پانی کی جاندار آواز میں مدغم ہو رہی تھی۔ یکا یک وہ اس بڑے پتّھر پہ بے دم سی ہو کر گر گئی۔اسے لگ رہا تھا کہ وہ ساری عمر اس پتّھر سے نہیں اُٹھ سکے گی۔وہ جو سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی لہروں کو دیکھ کر بے چینی سے ان کی طرف

بھاگ رہی تھی۔اب دکھ و تکلیف کی شدت سے حرکت کرنے کے بھی قابل نہ تھی۔اسے لگتا تھا کہ جیسے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ دیا ہو،کسی اور نے نہیں بلکہ اس کے اپنے آدم زاد نے...نہیں...نہیں...آدم زاد اس کے ساتھ ہرگز ایسا نہیں کرسکتا۔وہ اس کی محبت،اس کی قربانیوں کو کیسے فراموش کرسکتا ہے۔وہ اپنے آپ کو طفل تسلیوں سے بہلا رہی تھی مگر یہی سچ تھا کہ وہ اسے ہمیشہ کے لیے واپس چھوڑنے آیا تھا اور آخر کار،بلاتقصیر اسے اسی پتّھر کے کنارے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا۔وہ اس کے پیچھے بھاگ کر پہنچنا چاہتی تھی مگر اس کے قدموں نے جواب دے دیا۔ایسا لگ رہا تھا کہ زمین نے اس کے قدم جکڑ لیے ہیں۔وہ اپنی پوری قوت لگانے کے باوجود ایک قدم بھی نہ چل سکی۔وہ زور زور سے اسے پکارنا چاہ رہی تھی مگر آواز کے سر تو پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے وہ اس سے اپنا گناہ پوچھنا چاہ رہی تھی۔وہ اَب اپنے قدموں پہ مزید کھڑی نہ ہوسکی۔اگلے ہی لمحے صدمے سے نڈھال بے ہوش ہوکر جل کنارے گر چکی تھی۔

اسے سب سے پہلے ان سمندری سبز کچھوؤں کی ٹولی نے دیکھا،جو ساحل کی گیلی ریت پہ دُھوپ کے مزے لوٹ رہے تھے۔وہ اسے پہچان چکے تھے۔وہ حتّی المقدور تیزی سے اس کی طرف بھاگے۔ان میں سے دو اس کے قریب آ کر اسے ہلانے لگے اور باقی واپس سمندر کی طرف پلٹے تاکہ مہا مچھلی اور باقی سب کو اس کی واپسی کی اطلاع دے سکیں۔سب سے پہلے وہاں پہنچنے والا رنگیلی مچھلیوں کا ٹولہ تھا۔وہ اپنی دموں میں پانی بھر بھر کے اس کے منہ پہ ڈال رہی تھیں۔اندر کہیں دُور...جل میں مہا مچھلی کو لہروں نے کسی کی آمد کا سندیس دیا۔وہ تیزی کے ساتھ ساحل کی طرف آ رہی تھی۔سمندری گھاس نے بھی مانوس سی خوشبو پا کر خوشی سے جھومنا شروع کر دیا تھا۔سمندری گھوڑے نے اپنے منتر روک دیے۔رنگیلی مچھلیوں اور سمندری گھونگھوں کو بھی ہوا کے جھونکوں نے کچھ بتانے کی کوشش کی۔سارے جل

میں ہلچل مچ چکی تھی۔ سمندر کی لہروں نے ہوا کے جلترنگ کے ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا۔ آج جل کی رانی واپس آ گئی تھی۔ متروک شدہ گیت ساحلی ہوا میں ایک بار پھر سے گھل مل گئے تھے۔ کہیں دُور جاتے بادل جل کی رانی کو دیکھ کے سمندر پہ سایہ فگن ہو گئے تھے۔ سب ہی جل واسی جل سے جھانک رہے تھے۔ وہ ہوش میں آ چکی تھی اور اس کی نظر سب سے پہلے جس پہ پڑی وہ مہا مچھلی تھی۔

''جل پری'' (حصّہ 15)

وہ پوری طرح ہوش میں آ چکی تھی۔سب اس کی طرف ترحم بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔اس کی قوت گویائی تو پہلے ہی سلب ہو چکی تھی لیکن اس کی حالت زار دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اگر وہ بول بھی سکتی تو اب اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ویسے بھی اس کی زرد رنگت... پاؤں کے آبلے...اور بکھرے دُھول مٹّی سے اٹے بال اس کی داستان سنا رہے تھے۔

وہ مجرم بنی سب کے سامنے تھی۔سب اس کی زبانی اس کی کہانی سننا چاہ رہے تھے مگر کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اس سے کوئی کچھ پوچھتا اور وہ سناتی بھی کیسے جلا وطنی اور بے زبانی تو اسے آدم زاد کے ساتھ عشق کے ناکردہ گناہ میں تحفے کے طور پر سونپ دی گئی تھی۔اس کی حالت اس وقت تختہ دار پہ کھڑے اس شخص جیسی تھی جس کے پھانسی پہ لٹکانے یا تختہ دار سے اتارنے کی بات ہو رہی ہو۔وہ سب کی سوالیہ نظروں کی وجہ سے شدید گھبراہٹ

کے عالم میں لڑکھڑا کر مہا مچھلی کے آگے اس طرح گر پڑی کہ آدھی پانی کے اندر اور آدھی باہر تھی۔شکر صد شکر...کہ پانی نے اسے دھتکارا نہیں تھا،سمندر کی لہروں نے بے تابی سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا،اس کا چہرہ اُوپری دھڑ کے ساتھ پانی کے اندر تھا اور آدھا حصّہ پانی سے باہر سب دم سادھے اسے دیکھ رہے تھے اور سانس روکے کھڑے تھے کہ پتا نہیں اب پانی میں وہ سانس لے بھی پائے گی یا نہیں مگر یہ دیکھ کر سب نے سکون کا سانس لیا کہ وہ پانی میں ابھی بھی سانس لے سکتی تھی وہ جل کو دھتکار کے چلی گئی تھی مگر جل نے اسے گلے لگا لیا۔وہ جل پری سے بنت البحر بن کے انسانی دنیا میں چلی گئی تھی مگر جب انسانی دنیا نے بنت البحر کو دھتکار دیا تو جل نے ایک بار پھر سے اسے گلے لگا لیا۔

وہ سمندر کی بیٹی تھی اور اسے سمندر کی لہروں نے ہی ایک بار پھر سمیٹ لیا اور سب سے بڑی بات کہ جل کے بعد سب سے پہلے اسے گلے لگانے والی مہا مچھلی تھی جس کے بارے میں سب گمان کر رہے تھے کہ وہ شاید اسے معاف نہیں کرے گی اور جل کے اُصول توڑنے کے باعث اسے دوبارہ جل میں رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی مگر نہ صرف جل کے پانی نے بلکہ مہا مچھلی نے بھی اسے قبول کر لیا تھا اور وہ سب شکر ادا کر رہے تھے کہ جل کی بپھری لہروں نے اس کی سانسیں نہیں چھینی تھیں ورنہ وہ ساری عمر جل سے باہر کسی جوگن کی طرح بے چین پھرتی رہتی،مگر اب سب سے بڑا مسئلہ جو درپیش تھا کہ وہ تو اپنی لچکیلی دُم جس سے سارے جل میں تیرتی پھرتی تھی،گنوا بیٹھی تھی تو اب وہ جل میں کیسے تیر سکے گی۔سب جل واسیوں کے لیے یہ صورتِ حال کافی پریشان کن تھی لیکن یہ سب باتیں سوچنے کو ابھی کافی سمے پڑا تھا۔فی الحال ان کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ جل کی رانی جل میں واپس آ گئی ہے۔

وہ ابھی تیر نہیں سکتی تھی لہٰذا رنگیلی مچھلیوں کا ٹولہ خود ہی سمندری کچھوؤں کی مدد سے اسے اُٹھا کر جل محل لے آیا۔سب نے اسے آرام کرنے دیا۔وہ برسوں کے بعد آرام چین

کی نیند سوئی تھی۔انتہائی گہری نیند،جس میں وہ خواب میں ایک بار پھر آدم زاد کے ساتھ تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے،رفتہ رفتہ اس کے سنگ چلتے ہوئے ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئی تھی۔پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ یکا یک آدم زاد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اسے تو ابھی سیدھے راستوں پر بھی چلنا نہیں آیا تھا تو پہاڑ کی چوٹی پہ کیسے چڑھتی پھر اچانک ہی اس کا ہاتھ آدم زاد کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کے ہاتھ چھوڑتے ہی وہ بہت اُونچائی سے گر رہی تھی۔وہ پتھریلی چٹانوں اور نوکیلے پتّھروں پر سے لڑھکتی ہوئی زمین کی سمت آرہی تھی۔اس کی آنکھیں خوف اور تکلیف کی شدت سے بند تھیں وہ بہت زور سے کسی خنجر نما چٹان سے ٹکرانے والی تھی کہ ایک زوردار دہشت بھری چیخ سے اس کی نیند ٹوٹ گئی۔

آنکھ کھلی تو وہ اپنے سبز مخملیں سمندری گھاس سے بنے ہوئے بستر پہ تھی۔جس کے اردگرد رنگین سمندری پتّھر اور بے حد خوب صورت رنگ برنگے موتی جڑے تھے۔سارا جل اس کے اردگرد اکٹھا تھا اور اس کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا۔اس نے اپنے اردگرد دیکھا تو شانت ہو کر آنکھیں موند لیں۔وہ کتنا ترسی تھی اس طرح کے منظر یاد کر کے۔آج وہ نظارہ ایک بار پھر اس کے سامنے تھا۔کچھ ہی عرصے میں سب کچھ ویسا ہی ہو گیا مگر بدل گئی تھی تو وہ خود...اس کا دل...اس کی سوچیں...اس کے لب ہنسنا بھول چکے تھے۔اتنا پانی شاید پورے جل میں بھی نہیں تھا۔جتنا ہر دم اس کی آنکھوں میں رہنے لگا۔سب جل والے یہ سمجھتے تھے کہ شاید اس کی اُداسی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی لچکیلی دم کھونے کے باعث روانی سے تیرنے سے قاصر تھی اور مدھر آواز بھی کھو چکی تھی۔کچھ آدم زاد کی بے وفائی کو اس کی طویل خاموشی اور نہ ٹوٹنے والی چپ کی وجہ گردانتے تھے۔

رنگیلی مچھلیوں کے ٹولے کا خیال تھا کہ اس کے دل میں اب بھی آدم زاد کی یاد ہلکورے لے رہی ہے۔وہ دل ہی دل میں ان کے قیاسات پہ ہنس رہی تھی۔وہ انھیں کیا بتاتی

کہ بے وفا محبت کی یاد کبھی بھی دل میں باقی نہیں رہا کرتی۔ یا شاید وہ ہی ایسی تھی کہ اس نے آدم زاد کی محبت کو اس کے ہرجائی پن کے بدلے میں اپنے دل سے نکال دیا اور اس مردہ تالاب میں پھینک آئی تھی جہاں غلاظت سے بھرپور دلدل جیسے کیچڑ کا بدبو دار ڈھیر تھا جہاں سب جل والے جانے سے اجتناب کرتے تھے کیوں کہ وہاں مردہ سمندری جانوروں کو پھینکا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی بھوری چٹان کے قریب وہ ظالم، بدلحاظ اور غلیظ آکٹوپس رہتا تھا۔ لہٰذا جل پری آدم زاد کی محبت کو بھی وہیں دفنا آئی تھی مگر اس کی بے وفائی کا دُکھ اس کے دل میں دفن تھا۔ سب محبت کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ محبوب اور اس کی یاد کو دل سے نکال پھینکتے ہیں مگر خود سے کی گئی بے وفائی... کبھی نہیں بھولتے۔ اس میں سراسر نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔ جس کا تاوان انھیں عمر بھر ادا کرنا پڑتا ہے۔ وہ بھی ایک گھاٹے کا سودا کر آئی تھی جس میں اپنا روپ اپنی پہچان اور اپنی آواز تک کھو بیٹھی تھی۔ اس کے دل میں درد کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر قید ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ جل پری سے بنت البحر بنی اور بنت البحر سے ایک بار پھر جل پری بن چکی تھی۔

جل پری نے کسی کو اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں بتایا تھا کہ بنت البحر بننے کے بعد، وہ انسانی دنیا سے آدم زاد کی دان کی گئی ایک نشانی بھی ساتھ لائی ہے اس کے وجود میں دھیرے دھیرے پل رہی ہے۔ وہ اس بارے میں سوچ سوچ کے شدید پریشانی کا شکار تھی کہ جب مہا مچھلی اور سب جل واسیوں کو اس بارے میں پتا چلے گا تو ان سب کا کیا ردِ عمل ہوگا کیوں کہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سب جل واسیوں کے دل میں آدم زاد کے لیے سوائے نفرت کے کچھ نہیں ہے اور اَب وہ اس کی ہونے والی اولاد کے ساتھ کیا سلوک کریں... یہ سوچ کر ہی اسے ہول اُٹھ رہے تھے۔ اس سے پھر صبر نہ ہوا اور سب کچھ رنگیلی مچھلیوں کے گوش گزار کر دیا۔ کچھ تو بہت خوش ہو گئیں لیکن باقی سب کا خیال تھا کہ آدم زاد کی بے وفائی اور

بدسلوکی کی وجہ سے سب اس کے بچّے سے نفرت کریں گے۔ ایک نے تو یہ کہہ کے اس کے دل میں بہت خوف پیدا کر دیا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مہا مچھلی اسے جل میں رہنے کی اجازت ہی نہ دے۔ جل پری بہت خوفزدہ ہو گئی۔ اگر ایسی کوئی صورتِ حال پیدا ہو گئی تو وہ اس بچے کو لے کر کہاں جائے گی اور اسے جلد اَز جلد اس مسئلے کا حل سوچنا ہو گا کیوں کہ وہ زیادہ دیر اس بات کو نہیں چھپا سکے گی۔

''جل پری'' (حصّہ 16)

وہ جھل مگسی میں اس کا شاید آخری دن تھا۔وہ اپنے گھر کے ایک کمرے میں اندھیرا کیے کسی غیر مرعی نقطے پہ نگاہیں مرکوز کیے بیٹھا تھا۔وہ آج بہت سوچ بچار کے بعد جل پری کو اسی جل میں واپس چھوڑ آیا تھا جہاں وہ اسے پہلی مرتبہ ملی تھی۔اسے گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے یاد آرہے تھے۔وہ شروع شروع میں اس کی صحبت میں بہت خوش وخرم رہتا تھا اور لگتا تھا کہ ساری کائنات کی دولت اسے مل گئی ہے لیکن رفتہ رفتہ جب کاروبار کے معاملات بھی مزید پھیل گئے اور دیگر بہت سارے مسائل سامنے آئے تو اسے اپنے بے وقوفانہ فیصلے پہ پچھتاوا ہونے لگا۔حسن کی وہ دیوی اسے اب اپنی ناسمجھی اور بھولے پن کی وجہ سے جاہل، اجڈ اور گنوار دکھائی دینے لگی۔ایک طرف الوینہ تھی۔نفاست اور شائستگی کا شاہکار اور اس کے کاروبار کے معاملات میں اس کی ہم قدم جب کہ دوسری طرف ایک گونگی، بدتہذیب، جنگلی لڑکی۔جسے چلنے پھرنے سے لے کر اُٹھنے بیٹھنے تک کی کوئی تمیز نہیں تھی۔وہ

انتہا درجے کی خود غرضی اور مطلب پرستی سے خود سے ہی سوال جواب کر کے دونوں کا موازنہ کر رہا تھا اور اگر اس وقت اس کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یقیناً جل پری کو چھوڑ کر الوینہ کا انتخاب کرتا۔ جب انسان اپنے ضمیر کے خلاف جا کر خود غرضی سے کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اس کا ضمیر اسے اندر ہی اندر ضرور ملامت کرتا ہے لیکن وہ اپنے آپ کو حق بجانب قرار دینے کے لیے دوسرے کی خامیاں اور کمزوریاں تلاش کرتا رہتا ہے اور وہ بھی اس وقت ایسا ہی کر رہا تھا۔ دوسرا اس کے پاس الوینہ کو منتخب کرنے کی ایک اور توجیح بھی تھی جوان سب پہ بھاری تھی کہ جل پری کا انتخاب باپ کی ناراضگی کا سبب بنتی اور اس کی ساری عمر کی محنت اور ریاضت کے صلے میں جب فصل کاٹنے کا وقت آیا تو اس نے جل پری کو گلے لگا لیا اور اَب بعد کی جو صورتِ حال تھی وہ مزید گھمبیر ہوگئی تھی جب اسے پتا چلا تھا کہ اس کے وجود میں ایک اور سمندری یا انسانی وجود پرورش پا رہا ہے۔ اب اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ اسے جل میں چھوڑ آئے۔

وہ اسے کوئی نقصان نہیں دینا چاہتا تھا اور اس نے اپنے تئیں کوشش بھی کی کہ وہ پیپی کے ساتھ سیٹ ہو جائے مگر وہ اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ کسی طرح بھی ایڈجسٹ نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بار بار خود کو تسلی دے رہا تھا کہ اس نے یہ سب ٹھیک کیا ہے۔ اچھا ہے وہ... وہیں کی تھی اور اسے واپس وہ ادھر ہی چھوڑ آیا۔ اب وہیں خوش رہے گی۔ وہ بار بار ایک ہی بات دہرا رہا تھا۔ اس دن اسے ہمیشہ کے لیے واپس چلے جانا تھا کیوں کہ ریسٹ ہاؤس کا کام تقریباً آخری مراحل میں تھا لیکن وہ رات یہیں رکنا چاہتا تھا۔ وہ جانے کے لیے پر تول رہا تھا مگر قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔ اس کے دل میں شدید درد اُٹھا تھا۔ جس جگہ کھڑا تھا وہیں زمین پہ بیٹھ گیا۔ وہ پتا نہیں کتنا وقت وہاں پڑا رہا۔ رات بیت رہی تھی۔ اس نے دیکھا، جل پری اس کے پاس کھڑی تھی اس کے ہاتھ میں وہ پر تھا جو اس نے نوچ ڈالا تھا... وہ دوسرا پر توڑ

کے اسے دے رہی تھی لیکن وہ نہیں لے رہا تھا.. نہیں نہیں... جل پری... اگر دوسرا پر بھی ٹوٹ گیا تو تم کبھی زمین پہ نہیں آسکو گی۔ وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے پر توڑنے کو کہہ رہی تھی۔ وہ زور زور سے چلا رہا تھا۔ یکا یک اس کی آنکھ کھل گئی۔ خواب ٹوٹ چکا تھا۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل جل پری یہاں کھڑی تھی۔ مگر وہ یہاں کیسے آسکتی تھی۔ اس نے تو اس کے پر نوچ ڈالے تھے۔ وہ شدید کوفت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسے اب ایک دن بھی یہاں نہیں رہنا۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ کل صُبح ہوتے ہی جھل مگسی سے روانہ ہو جائے گا۔

اگلے دن منہ اندھیرے ہی وہ جھل مگسی سے روانہ ہو گیا۔ اس کے دل میں ایک خواہش نے سر اُٹھایا کہ وہ جانے سے پہلے آخری بار اسی پتّھر کنارے جائے اور دیکھے کہ جل پری کے ساتھ کیا ہوا مگر وہ نہ گیا شاید اسے یہ دھڑکا لگا تھا کہ جل پری ساحل پہ ہی کہیں موجود نہ ہو (مگر وہ کیسے ٹوٹے پروں سے جی سکتی ہے۔ اس نے خود کو ہی جواب دیا)۔ ہاں تو وہ پانی کے اندر چلی گئی ہوگی آخر کو وہیں تو رہتی تھی۔ (مگر اس نے تو انسانی روپ لے لیا تھا) وہ کیسے تیر پائے گی۔ اس کا ضمیر اس سے سوال کر رہا تھا۔ وہ سخت جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا۔ اس وقت تو اس نے ان آوازوں پہ کان نہ دھرا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ اگلی ساری عمر یہ آوازیں اس کا پیچھا کریں گی۔ کسی کے ساتھ کی گئی زیادتی تاعمر حساب لیتی رہتی ہے۔ مکافاتِ عمل کی چکی میں پستا انسان... نہ جیتا ہے نہ مر سکتا ہے۔

وہ لاہور واپس آ گیا تھا۔ دل پہ منوں کے حساب سے بوجھ لیے۔ گھر پہنچتے ہی الوینہ اور آنٹی دُردانہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ اس پہ کافی دن سے دباؤ ڈال رہی تھیں کہ وہ بنت البحر کو چھوڑ دے کیوں کہ ان کی رخصتی کی تاریخ فکس ہو گئی تھی اور الوینہ اب کسی بھی صورت اس گنوار لڑکی کو اپنے ہونے والے شوہر کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ پپی والے واقعے کے بعد ضرار اسے اپنے ہمراہ دوبارہ یہاں نہیں لایا تھا اور الوینہ کے دل

و دماغ میں یہ بات پختگی سے بیٹھ چکی تھی کہ ضرار جب تک اسے چھوڑ نہیں دیتا۔ وہ دو کشتیوں میں ہی سوار رہے گا۔ اس نے جاتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ وہ بنت البحر کو ہمیشہ کے لیے اس کے والدین کے گھر چھوڑ آئے گا اور واقعی میں اس نے اپنا کہا پورا کر دکھایا۔ دولت، طبقاتی فرق، اسٹیٹس آج ایک بار پھر بے چارگی، کمزوری اور مظلومیت پہ سبقت لے گیا تھا۔

وقت کا کام آگے ہی آگے بڑھنا ہے۔ وہ کبھی رکتا نہیں۔ بنت البحر کے جانے کے بعد الوینہ رخصت ہو کر اس کے گھر آ چکی تھی۔ دُردانہ بیگم اور الوینہ کا مطلب پورا ہو چکا تھا۔ ہشام صاحب نے دُردانہ بیگم کے سمجھانے بجھانے پہ سارے بزنس میں ضرار اور الوینہ کو مشترکہ پارٹنر بنا دیا۔ اس کی شادی ہوئے پورے دو ماہ ہو گئے تھے۔ دولت کی ریل پیل، خوب صورت بیوی، گھر، بینک بیلنس سب کچھ تو تھا اس کے پاس مگر ایک چیز نہیں تھی... سکون... جس کی کمی تا عمر پوری نہیں ہونی تھی۔ وہ شدید قسم کی ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔ کچھ ہی عرصہ میں اس کی حالت تشویشناک ہو گئی۔ وہ کبھی کبھار بالکل ٹھیک ہوتا مگر اچانک ہی ایسا دورہ پڑتا کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔

کل سے اس کی حالت بہت بری تھی۔ الوینہ اور اس نے ایک پارٹی میں جانا تھا۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس کے مجبور کرنے کی وجہ سے تیار ہونے لگا۔ تیار ہو کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا تھا۔ ساتھ ہی الوینہ آ کے کھڑی ہو گئی۔ وہ بغور دیکھنے لگا۔ دفعتاً الوینہ کی جگہ جل پری کا عکس ابھر آیا۔ اس کے ماتھے کے سب پر ٹوٹے ہوئے تھے۔ وہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی... وہ پیچھے پیچھے سرکنے لگا... نہیں... نہیں... جل پری... میں نے کچھ نہیں کیا... مجھے معاف کر دو۔ وہ پہلے زور زور سے چلا رہا تھا... پھر چہرہ ہاتھوں میں چھپا کے باآوازِ بلند رونے لگا... الوینہ کے لیے اس کی دماغی حالت ایک معمہ بنتی جا رہی تھی۔ وہ کچھ ہی دیر میں بیڈ پہ نیم دراز سو چکا تھا۔ الوینہ نے غصّے سے پاؤں پٹخے اور اکیلی ہی پارٹی میں شامل

ہونے چل دی۔

اس دن تو انتہا ہی ہوگئی۔جب آنٹی دُردانہ نے لاؤنج میں بیٹھے سب کی موجودگی میں اسے چھیڑ دیا کہ نئے مہمان کی آمد کا اعلان کب کرو گے تم دونوں...الوینہ ہنس کے چپ ہو رہی۔اسے بچے پسند نہیں تھے اور نہ ہی فی الحال اس کا ارادہ تھا۔وہ سب جو پہلے ٹیلی وژن کی طرف متوجہ تھے۔اچانک سے ضرار کی طرف متوجہ ہو گئے۔اس کے پورے بدن میں کپکپی طاری تھی۔اچانک ہی وہ آپے سے باہر ہوگیا اور زور زور سے چلانے لگا۔میں نے کچھ نہیں کیا جل پری...میں نے تمہارے بچے کو نہیں مارا...میں نے کچھ نہیں کیا۔وہ سب حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ہشام صاحب کا ماتھا ٹھنکا۔دُردانہ بیگم نے ان کی طرف دیکھ کے کہا! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ضرار کافی دن سے اس قسم کی حرکتیں کر رہا ہے۔وہ اسے دیکھ کر گہری سوچ میں مبتلا ہو گئے۔گزشتہ کافی روز سے وہ اس کی حالت دیکھ رہے تھے اور دُردانہ بیگم اور الوینہ بھی اس کے عجیب وغریب رویے کی شکایت کر رہی تھیں۔آج تو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔وہ پھر بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔! وہ دیکھو...جل پری کی لاش پڑی ہے اور تو اور میں نے اس کے بچّے کو بھی مار ڈالا۔وہ دیکھو! وہ اس کے بچے کی لاش پڑی ہے۔میں نے سب ختم کر دیا۔الوینہ اور دُردانہ بیگم چوں کہ بنت البحر سے واقف تھیں۔لہٰذا جل پری کا نام سُن کر وہ بھی بری طرح پریشان ہوگئیں کہ اب یہ کون ہے جس کا ضرار کی زندگی سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق ہے۔

رات ہوتے اسے سخت بخار نے آ گھیرا۔ڈاکٹر نے جسمانی سے زیادہ اسے کسی ذہنی اُلجھن کا شکار قرار دیا۔الوینہ اور دُردانہ بیگم کے لیے اب وہ ایک بوجھ سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔اس سے پہلے کہ اس کی حالت مزید خراب ہوتی اور الوینہ اور دُردانہ بیگم اسے فالتو سامان کی طرح اُٹھا کر باہر پھینک دیتیں۔ہشام صاحب نے اسے اس کی گرتی ہوئی صحت اور ذہنی

کیفیت کی وجہ سے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کروا دیا جہاں دو ماہ تک اس کا پوری طرح سے علاج ہوتا رہا۔ دو ماہ بعد اسے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ باقاعدگی سے علاج معالجے کی بدولت وہ کافی حد تک ٹھیک ہو گیا تھا مگر اس نے ایک مسلسل نہ ختم ہونے والی چپ کی چادر تان رکھی تھی۔ ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے جس نے اس کے دماغ پر گہرا اثر کیا اور اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔

’’جل پری‘‘(حصّہ 17)

سمندری گھوڑا ہفتہ بھر سے اپنے وہ جنتر منتر پڑھ رہا تھا کہ جس سے وہ جل پری کی کھوئی ہوئی آواز واپس لا سکے۔ سمندری گھونگے اور مچھلیاں روز سمندری گھوڑے کو ساحل کنارے کی سیلی مٹّی لا کر دیتے جس پر پڑھے گئے منتروں سے اس کی کھوئی ہوئی آواز واپس آجانی تھی۔ جسے اس کی جل بدری کے وقت سیپ میں بند کر کے سمندر کی سب سے آخری تہہ میں دفنا دیا گیا تھا، جوں جوں منتر پڑھے جا رہے تھے۔ سیپ جو جتنی مضبوطی کے ساتھ بند ہوا تھا اتنی ہی مشکل سے کھل رہا تھا اور آواز کی لہریں رفتہ رفتہ اس میں سے باہر آ رہی تھیں۔ جل پری کو آواز کا ندرانہ دان کرتے ہوئے اتنی تکلیف نہیں ہوئی تھی یا شاید اس وقت اس پہ انسانی دنیا میں جانے اور آدم زاد کی محبت حاصل کرنے کی دھن سوار تھی لیکن اب کی بار جب کہ اس کی اپنی ہی آواز واپس لوٹ رہی تھی تو وہ شدید کرب اور تکلیف سے گزر رہی تھی اور ان کی دن رات کی کوششیں بالآخر کارگر ثابت ہوئیں۔ اس سیپ سے وہ آواز واپس نکال لی گئی جو جل پری سے جل بدری کے عوض چھین کر اس میں بند کر دی گئی تھی۔

آواز کے سیپ سے باہر آتے ہی اس کی قوت گویائی بحال ہو گئی۔ سیلی مٹّی پر پڑھے گئے جنتر منتر ایک بار پھر کام کر گئے اور وہ دن سب جل واسیوں کے لیے انتہائی خوشی کا دن

تھا جب وہ ایک بار پھر سے بولنے کے قابل ہوگئی مگر جب کوئی خود ہی بولنا نہ چاہے تو قوت گویائی ہونے یا نہ ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا اور وہ نہ صرف ہنسنا بولنا بھول چکی تھی بلکہ اسے اپنے وہ تمام مدھر گیت بھول چکے تھے جو وہ اپنی ہمجولی رنگیلی مچھلیوں کے سنگ گایا کرتی تھی ۔ وہ پہروں ایک ہی جگہ خاموش بیٹھی رہتی ۔ پتا نہیں وہ بولنا ہی نہیں چاہتی تھی یا اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا ۔ من کا خالی پن اسے بس ہمہ وقت سوز و گداز میں مبتلا رکھتا اور سب نے جان لیا کہ اس کی خاموشی کی وجہ اس کی قوت گویائی سے محرومی نہیں بلکہ اُجاڑ دل کی ویرانی تھی جو آواز واپس آ جانے کے باوجود بھی دل پہ پھیلے اُداسی کے تاریک سائے اور لبوں پر لگے قفل نہ توڑ سکی ۔ سارا جل اس کو خوش رکھنا چاہتا تھا مگر اس کے لب ہنسنا تو درکنار بولنا بھی بھول چکے تھے ۔ ایسے میں مہا مچھلی نے ایک فیصلہ کر لیا تھا ۔

اسے تیرنے میں کافی مشکل پیش آ رہی تھی کیوں کہ وہ اپنی لچکیلی دم جس سے وہ سارے جل میں اٹھکیلیاں کرتی پھرتی تھی اور رنگیلی مچھلیوں کی ہمراہی میں خوشیوں کے ہنڈولے میں رقصاں رہتی تھی ۔ اسے گنوانے کے بعد وہ تہی دست تھی ۔ کھوئی ہوئی آواز تو لوٹ آئی لیکن سمندری گھوڑے نے آخری حد تک کوشش کر دیکھی کہ کوئی ایسا طریقہ ہو جس سے اس کی دُم بھی واپس آ سکے مگر اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ۔ یوں بھی زندگی میں ہونے والے بعض نقصانات ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی تلافی عمر بھر نہیں ہو سکتی اور ہجر کے صدمے اور جدائی کے الاپتے راگ کے ساتھ جنموں سے عطا کردہ روپ بدلنا اسے ایک ایسے خسارے سے دو چار کر گیا کہ جس کا تاوان اسے جنم بھر ادا کرتے رہنا تھا ۔ اس کے جسم پہ لگے وہ خوب صورت نگینے جو رات کی روشنی میں جگر جگر کرتے تھے ۔ وہ بھی روپ بدلتے سمے چوں کہ سب غائب ہو چکے تھے اور انہی کی مدد سے وہ راتوں کو بآسانی دیکھ سکتی تھی مگر اب وہ تیرتے ہوئے تھوڑی دیر میں ہی بہت جلد تھک جاتی تھی لہٰذا اسے جل میں اِدھر اُدھر جاتے ہوئے کسی نہ کسی سہارے

کی ضرورت پڑتی تھی کیوں کہ وہ اپنی دم کے بغیر ادھوری رہ گئی تھی تب ہی مہا مچھلی نے فیصلہ کیا کہ کسی جل واسی کو اس کی زندگی کا ساتھی بنادیا جائے۔مہا مچھلی نے اسے اپنی پسند بتانے کا پورا اختیار دیا تھا۔وہ سُن کے ہنس پڑی تھی۔کیا وہ اس قابل رہ گئی تھی کہ اب اپنی پسند کا جیون ساتھی چنتی۔ پورے جل میں ہلچل مچ گئی۔کئی ایسے تھے جو جل پری کے آدم زاد کے ساتھ جانے سے پہلے اس کے ساتھ زندگی بتانے کے خواب دیکھا کرتے تھےلیکن جب جل پری ان سب کو رد کر کے آدم زاد کے ساتھ چلی گئی تھی تو ان کے خواب ادھورے رہ گئے تھے۔اب انھوں نے دوبارہ سے جل پری کو حاصل کرنے کے سپنے دیکھنے شروع کر دیے اور کئی ایک نے تو سامنے آ کر جل پری کو اپنانے کی خواہش بھی ظاہر کر دی۔ ہر کوئی اسے اپنی وفاداری کا یقین دلا رہا تھا۔اسے خوش رکھنے کے وعدے کر رہا تھا مگر وفاداریوں کے جھانسے اور عیاریوں سے لے کر مکاریوں تک وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھ چکی تھی بلکہ اچھا خاصا خمیازہ بھی بھگت چکی تھی لہٰذا پیار ومحبت اور عشق کے پھینکے گئےکسی بھی جال میں پھنس کر دوبارہ اپنے آپ کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی مگر جس گھڑی اس کا انکار سب جل واسیوں کے خوابوں پر پانی پھیر رہا تھا...تقدیر اپنی چال چلنے کو پر تول رہی تھی اور سمے کی دھارا نے اسے مقرّر کردہ وقت پر اپنے بے رحم پنجوں میں جکڑ لینے کے بعد اس سے ایسا فیصلہ کروالیا کہ جو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔وہ جو انتہائی سختی سے اکیلے زندگی گزارنے کے فیصلے پہ ڈٹی کھڑی تھی۔تقدیر اس پہ اپنا وار چل گئی۔جب انسان اپنی زندگی اور مستقبل کے بارے میں بڑے بڑے دعوے کر رہا ہوتا ہے اور منصوبے بنا رہا ہوتا ہے تو وقت خاموش تماشائی بنا اس کا تمسخر اُڑا رہا ہوتا ہے۔

دراصل، جل پری کو چند دن سے وہ بھیانک آکٹوپس جو مردہ تالاب کے پاس بھوری چٹان میں رہتا تھا۔اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کر رہا تھا یا شاید وہ دانستا اس کی

گرفت میں آ گئی تھی۔ اس دن جب وہ رنگیلی مچھلیوں کے سنگ پانی میں تیرنے کی مشق کر رہی تھی تو اس کا دل بہلانے کے لیے وہ سب اسے اپنے گھیرے میں لیے جل میں بہت گہرائی تک نکل آئیں مگر جیسے ہی ان کی نظر بھوری چٹان پہ پڑی وہ گھبرا کر رُک گئیں اور جب رنگیلی مچھلیوں کا ٹولہ بھوری چٹان سے کچھ پہلے ہی واپس مڑنے لگا تو اسے پتا نہیں کیا سوجھی کہ اس نے کہا مجھے بھوری چٹان میں جانا ہے۔ رنگیلی مچھلیوں نے اسے سختی سے منع کیا کہ مہا مچھلی کے حکم کے مطابق بھوری چٹان کے قریب کبھی کوئی نہیں جا سکتا کیوں کہ وہاں وہ ایک آنکھ والا کانا، سیاہ بدنما دیو ہیکل ''آکٹوپس'' رہتا ہے اور کوئی بھی وہاں جانے کی کوشش نہیں کرتا تھا بلکہ سب اس بھوری چٹان کے قریب سے بھی گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

وہ بھوری چٹان چوں کہ اس آکٹوپس کی ملکیت تھی جسے اس کی حکم عدولی کی وجہ سے جل بدر کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد بھوری چٹان کو اس نے اپنا مسکن بنا دیا تھا۔ یہ سارے جل سے ہٹ کر بنی ہوئی تھی جو اندر سے بہت گہری تھی۔ پھر جب تقدیر میں گردش لکھی ہو تو انہونی بھی ہو کر رہتی ہے اور ایسے واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں جن کے بارے میں کبھی تصور بھی نہیں کیا گیا ہوتا تو ایسے ہی ایک دن بدقسمتی جل پری کو مکار آکٹوپس کے ٹھکانے تک لے آئی پتا نہیں اس کی آنکھوں پر اس لمحے وقت کے بے رحم ہاتھوں نے پٹی باندھ دی تھی یا وہ جان بوجھ کر اپنے آپ سے انتقام لے رہی تھی اور اگر انسان کو جانے انجانے میں اُٹھائے، اپنے کسی قدم کے بارے میں قبل اَز وقت چل جائے تو وہ بھول کر بھی وہ فیصلہ نہ کرے۔

’’جل پری‘‘ (حصّہ 18)

بعض اوقات انسان کوئی کام نہیں کرنا چاہ رہا ہوتا اور دل و دماغ کی چپقلش کے باعث حالات سے مجبور ہو کر کوئی کام کر گزرتا ہے جو اس کی زندگی کو ہی ملیا میٹ کر دیتا ہے کیوں کہ ایک باضمیر شخص کا دماغ اسے ضرور کچوکے لگاتا ہے بے حس ہونے کے لیے ضمیر کا مردہ ہونا بہت ضروری ہے۔ضرار بھی دو ماہ تک شدید ذہنی تناؤ میں مبتلا رہنے کے بعد زندگی کی طرف تو واپس لوٹ آیا مگر کائنات صرف لاشعور میں ٹھہرے لمحات پہ آ کے رُک گئی تھی۔ شعور و آگہی میں ہلچل مچ گئی تھی جب سے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔جل پری کے ساتھ کی گئی زیادتی اور بے وفائی اسے چین سے جینے نہیں دے رہی تھی۔ہشام صاحب کے بارہا پوچھنے پہ بھی اس نے ذہن کی مقفل گرہیں ان کے سامنے نہ کھولیں۔اس نے اندر ہی اندر ایک فیصلہ کر لیا تھا۔وہ جل پری کو ایک بار پھر سے تلاش کرے گا۔پوری دنیا چھان مارے گا۔آخر کہیں نہ کہیں تو اس کا سراغ مل ہی جائے گا۔وہ ایک بار مل جائے تو وہ اسے یقین دلا دے گا کہ وہ اس سے بے انتہا محبت کرتا ہے اور اس سے جدا ہو کر ایک پل بھی چین سے نہیں رہا لیکن

اسے اندازہ نہیں تھا کہ اذیتوں کے خلفشار میں بھٹکنا ہی اب اس کی زندگی بن جائے گا۔

الوینہ نے اسے پاگل کہہ کر اس سے علیحدگی کا اعلان کر دیا تھا اور دُردانہ بیگم اس کے اس فیصلے میں اس کے ساتھ تھیں۔ضرار کے لیے نہ ہی الوینہ میں کوئی دلچسپی رہی تھی نہ ہی بزنس کے معاملات میں۔اس نے باپ کی بے انتہا مخالفت کے باوجود اسے آزاد کر دیا تھا۔ اسے اپنی ذہنی حالت کا اندازہ تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے زبردستی باندھے رکھے۔وہ جل پری کے بچھڑ جانے کے کچھ عرصہ بعد ہی پچھتاوے کے احساس سے دوچار ہو گیا تھا۔محبت اور اس سے بچھڑنے کے احساس سے زیادہ اس کے ساتھ کی گئی زیادتی کا احساس نہ اسے جینے دے رہا تھا اور نہ مرنے۔اس کا دل ندامت سے ہر دم اسے کچوکے لگاتا تھا۔وہ اپنی ذہنی حالت کے بہتر ہونے کے بعد بھی ایک نہ ختم ہونے والی اذیت میں گرفتار تھا۔کسی معصوم اور بے گناہ کے ساتھ کی گئی زیادتی ایک باضمیر انسان کو جیتے جی مار دیتی ہے۔اسے ہر طرف سے جل پری کی آوازیں آتیں تھیں۔کبھی گھر میں باغ کے جھولے میں بیٹھی سمندری زبان کے سریلے گیت گا رہی ہوتی وہ بھاگ کے اس کے پاس جاتا تو وہ ہنستی ہوئی کہیں دُور جا کھڑی ہوتی۔اس کی حالت اگر بہتر بھی ہو گئی تھی تو ان یادوں کا کیا کرتا جو کسی سادھو کی طرح دل و دماغ میں ایک جگہ ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئی تھیں۔

جب کسی پل بھی چین نہ آیا تو اس نے بحری سفر شروع کر دیے۔اس نے سُن رکھا تھا کہ کھوئی ہوئی چیزیں اسی جگہ سے واپس ملتی ہیں جہاں سے گم ہوئی ہوتی ہیں۔وہ یہ سوچ لیے کئی بار جھل مگسی بھی آیا اور سارا سارا دن اسی پتّھر پر آ کے بیٹھا رہا۔اس اُمید پہ کہ شاید جل پری ایک بار پھر اسے مل جائے۔مگر وہ پاگل تھا۔کھوئی ہوئی محبت تو شاید کبھی مل ہی جاتی ہو لیکن اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کا گلا گھونٹنے والے ساری عمر پھرنا کام و نامراد رہتے ہیں۔وہ بھی پاگلوں کی طرح تمام ساحلوں کی خاک چھانتا رہا مگر وہ اسے نہ ملی۔اس نے جھل مگسی کا

چپہ چپہ چھان مارا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بار اسے وہ مل جائے تو وقت ثابت کر دے گا کہ وہ اس کے لیے کس قدر تڑپا ہے لیکن بعض اوقات وقت کے ثابت کرنے تک انسان خود ہی نہیں رہتا۔

اس دن ہشام صاحب نے بالآخر اس سے وہ سوال پوچھ ہی لیا جس سے وہ ڈرتا تھا۔ چشم پوشی سے کام نہیں بنتا تھا جب تک کہ حقیقت حال ان کے سامنے نہ آتی۔ وہ چائے پی رہے تھے۔ ضرار پاس ہی بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ وہ روزانہ کے اخبار دیکھتا کہ کہیں نہ کہیں اسے جل پری کی بھنک مل جائے۔ اچانک کمرے میں چھائے سکوت کو ہشام صاحب نے توڑا... یہ جل پری کون ہے؟ وہ حیران سا ہو کر انھیں دیکھنے لگا۔ وہ اس کی خاموشی دیکھ کر پھر گویا ہوئے۔ دیکھو ضرار! خاموشی کسی مسئلے کا حل نہیں۔ وہ پریشان ہو گیا کہ ان کو کس نے بتایا ہے۔ اس سے قبل کہ وہ پوچھتا، وہ خود ہی بول پڑے، دراصل تم بے ہوشی کے عالم میں ایک ہی نام بار بار لیتے رہے۔ وہ سخت گھبرا گیا۔ اس کی حالت غیر ہوتی دیکھ کے انھوں نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی لیکن دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اس کی تہہ تک ضرور پہنچیں گے۔ وہ اس کا جواب نہ پا کر ٹی وی پہ نگاہ مرکوز کر چکے تھے لیکن اس کی نظر اخبار میں لکھی ایک خبر پہ پڑ چکی تھی جس میں بحری جہاز کے کسی سفر کی تفصیلات لکھی تھیں۔ وہ شوق سے پڑھنے لگا۔ اس کے دماغ میں ایک نیا خیال آ گیا تھا۔ جوں جوں پڑھتا جا رہا تھا۔ امید کی ایک کرن سی دل میں جاگ گئی تھی۔

''جل پری'' (حصّہ 19)

سارا جل جانتا تھا کہ وہ ایک انتہائی جھوٹا دھوکے باز، مکار اور چالاک آکٹوپس ہے۔ اس کے آٹھ ہاتھ تھے۔ سیاہ مائل بھورے رنگ کا بد ہئیت، ایک آنکھ سے سارے جل کو شکار کرنے کا گر رکھتا تھا۔ اصل میں اس کی چرب زبانی اور حلاوت آمیز لہجہ اس سے واقفیت نہ رکھنے والوں کو اپنے دام میں بآسانی گرفتار کر لیتے تھے۔ جیسے ہی آکٹوپس کو پتا چلا کہ جل پری اس آدم زاد سے دھوکہ کھا کر انسانی دنیا سے واپس جل میں آ گئی ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیوں کہ وہ تو ازل سے جل پری کی آس لگائے بیٹھا تھا اور اس وقت اس کے ارمانوں پہ اوس پڑ گئی تھی جب جل پری جل کے ساتھ ساتھ اس کے دل کو بھی ویران کر کے انسانی دنیا میں چلی گئی تھی اور اَب اس کی جل میں واپسی کے بعد سے وہ اس کی اپنی زندگی میں شامل ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی قسمت کی ستم ظریفی سے جل پری بھوری چٹان میں داخل ہوئی تو آکٹوپس کی تو جیسے من کی مراد پوری ہو گئی۔ وہ اس قدر چالاک و مکار ہونے کے باوجود جل پری سے ایسے خوش اخلاقی اور مروت سے ملا کہ چند لمحے کے لیے جل پری

بھول ہی گئی کہ وہ اس وقت اس بھوری چٹان میں کھڑی اس مکار آکٹوپس سے مخاطب ہے جو اپنی عیاری و چالاکی کے لیے سارے جل میں بدنام ہے اور جس سے ملنے جلنے اور تعلق رکھنے سے مہا مچھلی نے انتہائی سختی سے منع کر رکھا ہے۔

وہ جل پری کے آنے پر انتہائی خوشی کا اظہار کرنے لگا اور اسے اپنی اس نام نہاد محبت کی جھوٹی کہانی سنانے لگا جو بقول اس کے بہت عرصے سے اس کے دل میں ڈیرہ ڈالے بیٹھی تھی اور اپنی بے قراریوں کے قصّے، جب جل پری نے ایک آدم زاد کا انتخاب کیا تھا۔ جل پری نے اس وقت اس کی کہی کسی بات پر یقین نہ کیا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی، وہ عشق کے خارزاروں پہ ایک عمر برہنہ پا چلی تھی۔ اب اس کی جھولی خالی تھی، من کے آنگن میں کھنکتے محبت کے انمول سکے کوڑیوں کے مول بکے تھے۔ آکٹوپس کی باتوں نے اسے ماضی میں بیتا ایک ایک پل یاد کروا دیا جسے وہ کبھی بھولے سے بھی نہیں دہرانا چاہتی تھی۔ وہ بنا کچھ کہے وہاں سے چلی آئی۔ اس کے دل میں ایک سوچ نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ اس پورے جل میں اسے یہیں اُمید کی کرن دکھائی دی۔ اگر اس کے بچے کو جل نے پناہ نہ دی اور جل بدری کا فیصلہ سنایا تو وہ بھوری چٹان میں پناہ لے سکتی ہے۔ اس کی آنکھیں یہ سوچ کر چمک اُٹھیں۔ اب یہی آخری حل بچا تھا۔ وہ اس سے اپنے ہونے والے بچے کے بارے میں عہد و پیمان لینے لگی۔ آکٹوپس کی تو جیسے دل کی مراد پوری ہوگئی پتا نہیں اس کی سازش کے تانے بانے ہی اس قدر مضبوط تھے کہ وہ اس کے جال میں پھنس گئی یا وہ جان بوجھ کر دھوکہ کھا رہی تھی۔ بہر حال جو بھی تھا اس نے اسے اپنی میٹھی باتوں سے بہت جلد قائل کر لیا۔ جب جل پری نے اسے کہا کہ وہ اب کسی کو بھی اپنے جیون کا ساتھی نہیں بنانا چاہتی تھی تو وہ اپنی موٹی اور بھدی آواز میں بولا کہ ”بس اگر کسی کو بھی نہیں بنانا تھا تو مجھے ہی بنا لو دیکھنا تو تمہارے لیے جنّت زمین پر لے آؤں گا۔ تمہیں بہت جلد جل بدر کر دیا جائے گا اور سب جل واسی مل کر تمہارے

بچے کو مار ڈالیں گے۔ جل پری کو جنّت کی خواہش نہیں تھی نہ ہی بھوری چٹان سے کوئی غرض تھی۔ ایک بار دل کی دنیا اُجڑ جائے تو سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے۔ جل پری کو بھی اب کسی کے ساتھ اور محبت کی ضرورت نہیں تھی۔ دل کی بستی اجڑنے کے بعد دوبارہ بسانا ایسے ہی تھا جیسے کہ دوسرا جنم لینا اور اسے معلوم تھا کہ اسے اچھے سے اچھا ساتھی ابھی بھی مل سکتا ہے لیکن اب وہ خود اچھی نہیں رہی تھی۔ ایک دھتکاری ہوئی ادھوری جل واسی جو نہ پوری عورت بن سکی۔ نہ ہی جل پری رہی تھی۔ لہٰذا اسے کسی ایسے کو اپنی زندگی سونپ دینی چاہیے جو اس کے ساتھ ساتھ اس کے ہونے والے بچے کی جان بھی بچا سکے۔ بس یہ خیال دل میں آتے ہی اس نے فیصلہ کرنے میں کچھ ہی پل لگائے لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اب کی بار سر سے آسمان چھننے کے بعد پاؤں کے نیچے سے زمین بھی کھسکنے والی ہے۔

مہا مچھلی نے اس کا فیصلہ سُن کر سر پیٹ لیا۔ وہ اس کی دماغی حالت پہ شک کرنے لگی مگر وہ اپنے ہی فیصلے پہ مصر تھی یہ نہیں تھا کہ اسے آکٹوپس سے محبت ہوگئی تھی لیکن یہ یقین ضرور آچکا تھا کہ آکٹوپس اس کی محبت میں مبتلا ہو چکا ہے اور اس کے بچے کو اس کے علاوہ کوئی نہیں بچا سکتا۔ ادھر مہا مچھلی اسے ہر وقت مجبور کرتی رہتی تھی کہ وہ اکیلے زندگی نہیں گزار سکتی اور اسے اب کسی کو زندگی کا ساتھی چن لینا چاہیے۔ تب ہی اس نے یہ فیصلہ کر لیا۔ مہا مچھلی نے تو سرے سے انکار کر دیا۔ یہ سراسر خودکشی کے مترادف تھا۔ اس سے تو ساری عمر ہی جل پری بغیر کسی جیون ساتھی کے گذار دیتی۔ سب جل واسی اس سے ناراضگی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ اس بار سب کی مرضی کے خلاف جا کر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ آکٹوپس ایک گھاگ شکاری تھا اسے پتا تھا کہ جل پری کا دل اندر سے اگر موم نہیں بھی ہوا تو وہ اپنے بچے کی زندگی بچانے کی خاطر راضی ہوئی ہے اس لیے اس نے نئے نئے حربوں سے اسے مزید رام کرنا چاہا وہ آٹھ ہاتھوں سمیت اس کے پاؤں پڑ رہا

تھااس کے آگے ہاتھ پھیلا کر اپنی محبت کے واسطے دے رہا تھا دیکھو سب جل واسی میرے بارے میں جھوٹی باتیں پھیلا رہے ہیں۔ دیکھو تو میں نے تمہارے استقبال کے لیے بھوری چٹان کیسے سجائی ہے۔ اندر بس محبت بھری جنّت ہی ہے۔ اسے شدید اشتیاق نے آ گھیرا وہ گھاگ اس کا، دل پگھلتا محسوس کر چکا تھا۔ وہ ایک مرتبہ بھوری چٹان کو اس دن دیکھ چکی تھی جب پہلی مرتبہ آکٹوپس سے ملی تھی اور دوسری مرتبہ اب دیکھ رہی تھی... اس دن تو اُوپری انداز میں دیکھی تھی آج آکٹوپس نے اسے بہت سجایا تھا۔ مکار آکٹوپس نے اس کا دل پگھلانے کے لیے ہر طرف رنگ برنگ پھُول لا کر سجائے تھے لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ پھول محض دھوکا اور فریب سے اسے پھانسنے کے لیے ہیں۔ آخر کار وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا۔ وہ شاید جان بوجھ کر اس کے جھانسے میں آ گئی تھی۔ ہوسکتا تھا کہ وہ جل واسیوں کے سمجھانے بجھانے پہ راضی ہی ہو جاتی اور آکٹوپس کے ساتھ شادی کے فیصلے سے پیچھے ہٹ جاتی اگر اس نے مہا مچھلی اور سمندری گھوڑے کے مابین ہونے والی گفتگو نہ سُن لی ہوتی۔

چند دن پہلے وہ جب رنگیلی مچھلیوں کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد جل محل میں داخل ہوئی تو اس نے مہا مچھلی اور سمندری گھوڑے کے درمیان ہونے والی گفتگو سُن لی تھی۔ اس کے کانوں نے سنا جب سمندری گھوڑا مہا مچھلی سے مخاطب تھا۔ مہا مچھلی! اگر جل پری اس آدم زاد کے ساتھ شادی کے بعد اس کی ہونے والی اولاد یہاں لے آتی تو آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتیں۔ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو سمندری گھوڑے۔ ایسا کیسے ممکن ہے۔ مہا مچھلی نے حیرانی سے کہا۔ مہا مچھلی! ممکن تو یہ بھی نہ تھا کہ ایک جل پری کی شادی زمین زاد سے ہوتی۔ سمندری گھوڑے کی بات سُن کر مہا مچھلی چونک گئی۔ میں اس بد بخت کی اولاد کو کبھی جل میں رہنے کی اجازت نہ دیتی اور اسے جل بدر کر دیتی۔ جس طرح اس آدم زاد نے ہماری رانی کے ساتھ کیا ہے۔ آدم زاد ہی بے وفا ہے... تو اس کی اولاد سے کیا اُمید لگا سکتے۔

صد شکر... کہ جل پری ایسی آزمائش میں نہیں پڑی۔ ورنہ آدم زاد کی بے وفائی کے ساتھ ساتھ اسے اپنی اولاد سے جدائی کا دُکھ بھی برداشت کرنا پڑتا۔ سمندری گھوڑا درحقیقت، جل پری کی بدلتی کیفیت کے بارے میں اس وقت ہی جان گیا تھا... جب وہ اس کی آواز واپس لانے کے لیے چلہ کاٹ رہا تھا۔ وہ نہایت گہری نظر اور پرسوچ انداز سے کسی مثبت نتیجے پہ پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ مہا مچھلی کے تاثرات جان کر شدید پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ جل پری نے ان کی تمام گفتگو من وعن سُن لی تھی اور وہ جو مہا مچھلی کو یہ کہنے آئی تھی کہ اب کی بار اس کی حکم عدولی نہیں کرے گی اور اس کی مرضی سے ہی اپنی زندگی کا فیصلہ کرے گی۔ وہ ان کی گفتگو سُن لینے کے بعد اُلٹے قدموں واپس مڑ گئی۔ اب اس کا رُخ ایک مرتبہ پھر آکٹوپس کی بھوری چٹان کی طرف تھا۔

جل پری جل محل سے لوٹتے سمے سخت پریشان تھی۔ اس کے ہراساں ہونے کی وجہ اس کے ہونے والے بچے کی زندگی تھی۔ اس کا دل و دماغ سوچ سوچ کر ماؤف ہو رہا تھا۔ مختلف حل سوچتے سوچتے اس کا دل و دماغ ایک ہی نکتے پہ مرکوز ہو گیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ بھوری چٹان کے پاس کھڑی تھی۔ آکٹوپس اسے دیکھ کر جیسے کھل اٹھا۔ وہ اس کے ساتھ اندر آگئی تھی۔ اس نے بغیر لگی لپٹی رکھے آکٹوپس سے کہا، مجھے تمہارا ساتھ ایک شرط پہ ہی منظور ہے۔ آکٹوپس جو جل پری کو اچانک وہاں دیکھ کر ہی خوش ہو گیا اس کی تو جیسے لاٹری نکل آئی۔ جل پری! مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے بچے کو جل واسیوں سے بچا لو گے۔ کسی بھی صورت اسے ان کے حوالے نہیں کرو گے۔ وہ رُک رُک کر بولی۔ ہاں جل پری میں وعدہ کرتا ہوں وہ جل پری کی بات سُن کے بے ساختہ بولا تھا۔ جل پری کو شدید دُکھ و اضطراب نے آن گھیرا... دل کہہ رہا تھا۔ کس پہ اعتبار کر رہی ہو مگر زندگی بہت ظالم ہے، بعض اوقات انسان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ دشمن پہ ہی اعتبار کرنے پہ مجبور

ہوجاتا ہے۔جل پری کے پاس بھی اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پتا نہیں یہ محبت اس سے اور کتنے امتحان لے گی۔ پہلے آدم زاد کی محبت میں اپنا روپ بدل ڈالااور اَب اپنی ہونے والی اولاد کی جان بخشی کے لیے اپنی زندگی داؤ پہ لگا دی تھی۔آکٹوپس کی تو جیسے عید ہوگئی۔وہ بولا تھا...! جل پری۔یہ سب جل واسی میرے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔

''جل پری'' (حصّہ 20)

تم دیکھنا...کہ میں کیسے اس بھوری چٹان کو تمہارے لیے جنّت بنا دوں گا۔ یہاں پیار بھرے گیت اور رنگ برنگے جلترنگ ہوں گے۔ میں اسے برقی قمقموں سے سجا دوں گا۔ وہ جل پری کو یقین دلا رہا تھا۔ جل پری کو پیار بھرے نغموں اور برقی قمقموں سے قطعاً کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ جواب میں بولی تھی۔ بس مجھے میرے بچے کی زندگی کی ضمانت دے دو۔ آکٹوپس جو ہر حال میں اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ بولا، تمہاری اور تمہارے بچے کی زندگی اس بھوری چٹان میں محفوظ ہے۔ بس تم جل واسیوں کی باتوں میں مت آنا اور اپنا فیصلہ نہ بدلنا اور آخر کار یہی ہوا جل واسیوں کی محبت اور مہا مچھلی کی ناراضگی بھی اسے اس فیصلے سے باز نہ رکھ سکی۔ رنگیلی مچھلیوں نے اسے بہت سمجھایا اور کہا، جل پری تم مہا مچھلی کو اپنے بچے کے بارے میں بتا دو۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ اسے قبول کر لے گی۔ جل پری بولی، ارے نہیں سکھیو...میں اس بابت سمندری گھوڑے اور مہا مچھلی کی گفتگو سُن چکی ہوں۔ وہ کبھی بھی ایک آدم زاد کی اولاد کو یہاں نہیں پلنے دیں گے۔ میرے پاس اپنے بچے کی زندگی بچانے کا

اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ شدت کرب سے بولی تھی۔ رنگیلی مچھلیاں دل مسوس کے رہ گئیں۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب وہ ایک بار پھر جل چھوڑ کے بھوری چٹان میں جا رہی تھی۔

اس دن پورا جل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ رنگیلی مچھلیاں اپنا رقص بھول گئیں تھیں۔ سمندری گھوڑے کے تمام جنتر منتر بے کار گئے تھے۔ مہا مچھلی کو شدید چپ نے آ گھیرا تھا۔ ایک ایسی چپ جو اگلی ساری عمر جل پری کے لبوں پہ لگ جانے والی تھی۔ وہ اپنی چہیتی اور پیاری جل پری کو دیدہ و دانستہ خودکشی کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی مگر اسے روکنے سے قاصر تھی کیوں کہ وہ اس کی ضد سے واقف تھی۔ کہ وہ کوئی بات جب ایک بار ٹھان لیتی تھی تو چاہے آسمان زمین ایک ہو جائیں۔ اس سے ٹلتی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک بار پھر اس نے دھوکا کھانا ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اب کی بار جب وہ ٹوٹے گی تو شاید دوبارہ کبھی نہیں جڑ سکے گی۔ ٹوٹنے سے جڑنے تک کے عمل میں انسان مزید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ شکست و ریخت اسے کرچی کرچی کر ڈالتی ہے۔ مہا مچھلی اور دوسرے جل واسی اس کے اس فیصلے کو اس کی ضد سمجھ رہے تھے اور صرف سمندری گھوڑے اور رنگیلی مچھلیوں کو علم تھا کہ اس نے یہ ہولناک فیصلہ کیوں کیا ہے۔

جل پری جس دن جل واسیوں کو چھوڑ کر آکٹوپس کی زندگی میں شامل ہو گئی۔ اس دن سے ہی اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ اور اسے نہیں معلوم تھا کہ آنے والا ہر نیا دن اس پہ صرف آنسوؤں کی تحریر لکھا کرے گا۔ وہ اپنا آدھا دھڑ آدم زاد کی محبت کو پانے کے لیے گنوا بیٹھی تھی اور بدلے میں نہ آدم زاد کی محبت نصیب ہوئی نہ ہی اس کا ساتھ اور ملی بھی تو آدم زاد کی کج روی، بے وفائی اور آخر کار اس کی خود غرضی کا شکار ہو کر وہ اپنا سب کچھ گنوا کے آج آکٹوپس جیسے ایک بدصورت، بدہیئت اور بدکردار کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی اور

اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی اگلی ساری زندگی ہی اس غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔ اسے وہاں رہتے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا اور اسے اندازہ ہو گیا کہ وہاں نہ تو وہ جنّت تھی نہ برقی قمقمے تھے جن کے دعوے آکٹوپس نے کیے تھے اور سب سے بڑھ کے نہ ہی وہ محبت تھی۔ ”محبت“... تو وہ احساس ہے جو خوشبو کی طرح دکھائی نہ دینے کے باوجود چاروں اطراف سے گھیرے رکھتا ہے۔ اپنے ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ جو دکھائی نہ دینے کے باوجود چہار سو موجود رہ کر، تخیّل سے لے کر تصوّر تک اور خواب سے لے کر حقیقت تک، قدم بہ قدم ہر سانس میں محسوس ہو اور سب سے بڑھ کے محبت کا کھو جانا سوہانِ رُوح ہو لیکن اسے رفتہ رفتہ اندازہ ہو گیا کہ اس نے ایک بار پھر زندگی کا ایک غلط فیصلہ کیا ہے۔ پہلی محبت میں بھی ناحق اپنا آپ گنوا دیا اور اَب کے آکٹوپس جیسے بے مروت اور ناہنجار سے اچھائی کی اُمید لگا بیٹھی تھی جس سے سارا جل متنفر تھا اس کے بے بنیاد اور کھوکھلے دعوے پہ وہ سارا جل چھوڑ کے اس کے ہمراہ چلی آئی تھی۔ وہ آئے دن پرت در پرت اس پہ کھلتا جا رہا تھا اور وہ جان گئی تھی کہ اس کی ذات دھوکا، فریب، جھوٹ، بے ایمانی اور لالچ کا منبع ہے اور سب سے بڑھ کر اس میں منافقت کوٹ کوٹ کے بھری ہے اسے یقین ہو گیا کہ لوگ اس کے بارے میں جو بھی کہتے تھے بالکل سچ کہتے تھے۔ وہ اس قدر لالچی اور خود غرض تھا کہ اپنی ذات کے علاوہ اسے کسی دوسرے کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اسے بھوری چٹان سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ بظاہر اسے کہتا تھا کہ چوں کہ وہ ابھی پوری طرح تیرنے سے قاصر ہے اس لیے وہ اسے اکیلے باہر نہیں جانے دیتا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسے خوف تھا کہ جل پری بھی جلد ہی اسے چھوڑ دے گی کیوں کہ اس کے بد خصائل و عادات کی وجہ سے اس کے ساتھ زیادہ دن کوئی ٹکتے نہیں پاتا تھا جل پری جو قبل ازیں آدم زاد کے عطاء کیے کمرے میں بہت عرصہ تک قیدِ تنہائی کاٹتی رہی اب بھوری چٹان اس کا مسکن بنی اور اسے نہیں معلوم تھا کہ اب اگلی ساری عمر اسے اس خوفناک بھوری چٹان میں ہی

قید رہنا ہے اور شاید یہی اس کا مدفن بنے گی۔

زندگی بہت کٹھور اور بے درد ہے۔سانس چلنے تک جیتے رہنا شرط ہے۔اندر سے مرتا ہوا انسان باہر سے ہنس بول رہا ہوتا ہے جیسے جیسے دل کا درد بڑھتا ہے قہقہے آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔کرچی کرچی ہو کر بکھر جانے والا انسان دوسروں کو اعتماد کا درس دے رہا ہوتا ہے۔محبت اور یگانگت کا پیغام رساں خود سو ٹکڑوں میں بٹا ہوتا ہے۔نہ جانے چراغ تلے ہمیشہ اندھیرا ہی کیوں رہتا ہے۔جل جل کر دوسروں کو روشنی دینے والوں کی اپنی زندگی اندھیروں میں ہی ڈوبی رہتی ہے لیکن یہ سب حساس دلوں کی سوداگری ہے من مرضی کے سودے ہیں۔دنیا کھٹور دلوں اور خود غرضوں سے بھری پڑی ہے۔ایک ذرا سا دل ہی سخت کرنا ہے نا تو زندگی سہل ہو جاتی ہے مگر نرم اور حساس دل رکھنے والے کبھی بھی آسان زندگی نہیں گزارتے اور ایک ایسی ہی اذیت بھری زندگی جل پری آکٹو پس کے سنگ گزار رہی تھی۔

''جل پری'' (حصّہ 21)

اسے اپنی پوری زندگی میں جس چیز سے سخت نفرت تھی۔اب وہ اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی اور وہ تھی بے ایمانی،جھوٹ،دھوکہ،فریب،منافقت جس کا اسے اب آئے دن سامنا کرنا پڑتا تھا وہ زندگی کا کچھ حصّہ آدم زادوں کی دنیا میں بھی گذار کر آئی تھی اور اسے اندازہ تھا کہ چور ڈاکو اور لٹیروں کا بھی کوئی نہ کوئی مذہب ضرور ہوتا ہے وہ ساری دنیا سے دھوکے کرتے ہیں لیکن کم اَز کم اپنے خاندان سے تو سچ بولتے ہیں اور مخلص ہوتے ہیں مگر اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کسی زہریلے بچھو سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔اسے اپنی طاقت اور آٹھ ہاتھوں کا بہت غرور تھا اور سچ ہی تھا کہ اس کے ہر ہاتھ تلے ایک نیا شر چھپا تھا۔وہ ہر آنے والے لمحے میں اس کی اس خصلت سے واقف ہوتی جا رہی تھی۔

وہ کئی مرتبہ جل واسیوں سے ملنے گئی تھی مگر کسی کو کچھ نہیں بتایا...رنگیلی مچھلیاں...ان برقی قمقموں کا پوچھتی رہ گئیں جن کا اس نے بھوری چٹان سے ایک مرتبہ واپس آنے کے بعد بتایا تھا۔وہ اس سے ہنس بول رہی تھیں مگر اس کے لب ایک بار پھر سے ہنسنا بھول چکے تھے۔وہ مہا مچھلی کی کھوجتی نگاہوں سے بہت پریشان ہو رہی تھی...جو پوری طرح اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔وہ مہا مچھلی کو دکھانے کے لیے زور زور سے قہقہے لگانے لگی مگر

اس کی وہ ہنسی جس میں کسی وقت مدھر جلترنگ بجتی محسوس ہوتی تھی۔آج ایسا لگ رہا تھا کہ سیکڑوں کانچ تھے جو ایک چھناکے سے سارے کے سارے ٹوٹ چکے تھے۔مہا مچھلی نہایت خوفزدہ ہوگئی تھی...ایسی ہنسی سے تو چپ ہی بھلی تھی۔اس کے ٹوٹے کانچ جیسے قہقہے اس کو شدید تکلیف دے رہے تھے۔اس نے اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ہلکورے لیتے درد کی لہروں کو چھپانے کے لیے اس نے نظریں چرالیں۔وہ سارے جل کو اُداس کر کے وہاں سے چلی آئی تھی۔

وقت سرکتا جارہا تھا۔ہر آنے والا دن اسے دیوار کے ساتھ لگاتا جارہا تھا۔اسے محبت تو اس سے پہلے ہی نہیں تھی مگر اب وہ آکٹوپس سے شدید نفرت کرتی تھی۔وہ ایک بدنما اور غلیظ دل رکھتا تھا۔اس نے پہلے بھی کئی رنگیلی مچھلیوں کو کھایا تھا اور اَب بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ باہر جا کر رنگیلی مچھلیوں کے ٹولے کو اپنے ساتھ لایا کرے اب اسے سمجھ آئی تھی کہ سارا جل کیوں اسے بُرا بھلا کہتا تھا۔اس نے جل پری کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔وہ ایک طرح سے اس کی قید میں تھی۔وہ جب بھی رنگیلی مچھلیوں سے ملتی،وہ اسے پاؤں لہرا کر تیرنے کی مشقیں کرواتی لیکن آکٹوپس اس بات سے پوری طرح لاعلم تھا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ جل پری اپنے آپ تیر سکے۔وہ اسے ہمیشہ کے لیے اپاہج رکھنا چاہتا تھا تا کہ وہ ساری عمر اس کے تسلّط سے باہر نہ آسکے کیوں کہ اسے علم تھا کہ جوں ہی جل پری نے دوبارہ تیرنا سیکھ لیا وہ ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ جائے گی۔وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس نے زبردستی جل پری کو اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے لیکن اَنا،خودغرضی،منافقت اور ہٹ دھرمی کے بت کو توڑنا اپنے آپ کو گرانے کے مترادف تھا۔

آج پھر وہ رنگیلی مچھلیوں کے ساتھ اپنی پرانی جگہ پر آئی تھی۔وہ سب اسے ہنسنے بولنے پہ اُکسا رہی تھیں۔اسے اپنے کھیل تماشے میں شامل کر رہی تھیں مگر اس کے لب ہنسنا بھول چکے تھے۔اسے خود سے زیادہ ان رنگیلی مچھلیوں پہ ترس آرہا تھا جو اسے خوش کرنے کی کوشش

میں رقص کر کر کے ہانپ رہی تھیں۔اس نے زبردستی قہقہہ لگانے کی کوشش کی۔اس کا سارا بدن لرز رہا تھا۔اسے کہیں سے آدم زاد کی آواز سنائی دے رہی تھی ساتھ ہی بہت گندی سی بدبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی...وہ ان ہڈیوں اور گوشت کے گلنے سڑنے کی تھی جو آکٹوپس سے ہر وقت آتی رہتی تھی۔قہقہہ لبوں پہ آنے سے قبل ہی دم توڑ چکا تھا۔دل میں بے طرح درد جاگ اُٹھا...اس پہ قابو پاتے پاتے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ نکلیں۔وہ زور زور سے ہانپ رہی تھی۔رنگیلی مچھلیاں اپنا کھیل بھول کر اَب اسے سنبھال رہی تھیں۔

وہ پچھلے کچھ دن سے ہی رنگیلی مچھلیوں کی ہمراہی میں وقت گزار رہی تھی اور یہ موقع اسے قدرت نے خود ہی فراہم کر دیا کہ آکٹوپس کو دراصل کچھ دن پہلے کسی بحری جہاز کے سمندر میں لنگر انداز ہونے کی اطلاع ملی تھی اور وہ روزانہ وہاں جا کے اپنا شکار ڈھونڈتا تھا۔وہ جہاز شاید خراب تھا جس پہ بہت سے انسان بھی پھنسے تھے اور ان کو ابھی تک وہاں سے بحفاظت نکالنے کا انتظام نہیں ہو سکا تھا۔خبر مہا مچھلی کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔جل کے اُصول سب کو اچھی طرح معلوم تھے۔وہ کبھی بھی کسی مجبور و بے کس کو شکار نہیں کرتے تھے بلکہ جہاں تک ہوتا، پس پشت رہ کر ان کی مدد کی جاتی۔وہ رنگیلی مچھلیوں کو بتا رہی تھی کہ آکٹوپس روزانہ کہاں جاتا ہے۔پچھلے کچھ دن سے وہ ادھ کھائے انسان وہاں بھوری چٹان میں لے کر آیا کرتا تھا اور اس گندگی اور تعفن سے بچنے کے لیے جل پری اس کے جاتے ہی بھوری چٹان سے نکل کر رنگیلی مچھلیوں کی سنگت میں آ جاتی تھی۔اب وہ ٹانگوں اور پیروں کی حرکت سے آہستہ آہستہ تیر سکتی تھی۔گو کہ وہ پُرانی والی طاقت و توانائی تو واپس نہ آ سکی تھی۔

رنگیلی مچھلیاں اس کی حالت کے پیشِ نظر خاموشی سے اسے گھیرے میں لے کر بیٹھ گئیں۔اس کا لرزتا کانپتا بدن اب ساکت ہو چکا تھا۔وہ ہنسنے کی کوشش ترک کر کے رنگیلی مچھلیوں سے مخاطب ہوئی۔آکٹوپس نہایت ہی غلیظ ہے۔ابھی بھی وہ وہی کام کرتا ہے جن کی

وجہ سے اسے مہا مچھلی نے جل سے نکالا تھا اور رنگیلی مچھلیاں کپکپا کر رہ گئیں جب انھیں پتا چلا کہ وہ اُوپر پھنسے بحری جہاز سے انسانوں کو شکار کر کے بھوری چٹان میں لاتا ہے۔ زیادہ تر اس کے زہریلے پنجوں کے خوف سے پہلے سے مر چکے ہوتے ہیں... کچھ میں زندگی کی رمق باقی ہوتی تھی اور پانی کی تہہ میں پہنچتے ہی مر جاتے تھے۔ وہ رنگیلی مچھلیوں کو سب کچھ بتاتے بتاتے ہانپ رہی تھی۔ رنگیلی مچھلیاں تو اس سے پہلے سے ہی متنفر تھیں۔ وہ سب اس کا دل بہلانے لگیں۔ وہ اپنی پیاری سہیلی کے درد میں اس کے ساتھ شریک تھیں اور اس کی جسمانی حالت سے بھی واقف تھیں۔ وہ اسے دلاسہ دے رہی تھیں۔ ان میں سے چلبلی مچھلی بولی! جل پری تمہیں اپنے اور آکٹوپس کے متعلق مہا مچھلی کو سب بتا دینا چاہیے۔

قرمزی مچھلی نے کہا! مجھے یقین ہے کہ جب مہا مچھلی کو جل پری کے بچے کا پتا چلے گا تو وہ سب بھول جائے گی اور جل پری اور اس کے بچے کو ایک مرتبہ پھر سے گلے لگا لے گی مگر جل پری بولی، نہیں نہیں... میں مہا مچھلی کو مزید کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ بس جو مجھے مل رہا وہ میری قسمت ہے لیکن میں اپنے ہونے والے بچے کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔ سمجھانے بجھانے کی تمام کوششیں ناکام ہوتے دیکھ کر رنگیلی مچھلیوں نے ایک بار پھر ملنے کا وعدہ کر کے واپس جل جانے کا ارادہ کیا اور حسبِ معمول اسے بھوری چٹان کے قریب تک چھوڑنے گئیں۔ آج وہ معمول سے کچھ زیادہ ہی وقت رنگیلی مچھلیوں کے ساتھ رہی تھی اور خوفزدہ تھی کہ کہیں آکٹوپس واپس نہ آگیا ہو...

’’جل پری‘‘ (حصّہ 22)

اسے ہر صورت آکٹوپس کے آنے سے قبل بھوری چٹان میں واپس جانا تھا... وہ کئی روز سے اس کی واپسی پہ اس کے پنجوں میں جکڑے ادھ کھائے انسان دیکھ رہی تھی... اور... اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے آگے کیا کچھ دیکھنا ہوگا جو شاید اس کے حواس ہی معطل کر دے گا۔ وہ رنگیلی مچھلیوں کو الوداع کہہ کر بھوری چٹان کی طرف جا رہی تھی... چلبلی مچھلی اسے یہاں چھوڑنے آئی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کے واپس پلٹی اور جل پری نے جیسے ہی اندر قدم رکھا سمندری کتے نے اسے اطلاع دی کہ آکٹوپس آج اس سے پہلے آ گیا تھا اور ایک انسان کو ادھ کھایا یہاں چھوڑ کے واپس بحری جہاز کی طرف چلا گیا تھا کیوں کہ آج بحری جہاز میں پھنسے لوگ ایک ایک کر کے نکالے جا رہے تھے اور ان کو واپس بھجوایا جا رہا تھا اور آکٹوپس کی لالچ کی انتہا کہ وہ جلدی جلدی شکار کر کے لاتا جا رہا تھا اور پھر اُوپر چلا جاتا... ایسے میں اسے جل پری بھول چکی تھی۔ بھول تو جل پری آدم زادے کو بھی چکی تھی۔ جس سے بچھڑتے سمے خیال تک نہ تھا کہ زندگی میں دوبارہ کبھی اس سے مُلاقات ہو سکتی ہے۔ جوں ہی وہ بھوری چٹان میں داخل ہوئی سامنے ہی پڑے بے سدھ کسی وجود نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔ وہ منہ کے بَل اُلٹا لیٹا تھا اور کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ مر گیا یا زندہ

ہے۔ کچھ عجیب سی کشش اسے اس سمت کھینچتی چلی جارہی تھی ۔سمندری کتے نے بتایا کہ اسے ابھی ابھی یہاں چھوڑ کر آکٹوپس اُوپر مزید شکار لانے گیا ہے ۔اس سے صبر نہ ہوا اور اسے سیدھا کیا تو اب وہ اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہی تھی ۔محبت کی خوشبو میلوں دُور سے محسوس کی جا سکتی ہے...وہ ضرار تھا...وہ خود غرض اور بے وفا آدم زاد جس کی بے وفائی نے اس کی رُوح تک کو چھلنی کر دیا تھا۔اس کی ایک ٹانگ گھٹنے سے نیچے تک زخمی تھی کیوں کہ آکٹوپس انسانوں کو لاچار بنا کے پہلے یہاں ڈال دیتا تھا کہ وہ مزاحمت نہ کر سکیں یا بھاگنے کی کوشش نہ کریں اور پھر پانی میں چند منٹ ہی ڈوبے رہنے سے موت تو واقع ہو ہی جاتی تھی لیکن آدم زاد میں زندگی کی آخری رمق باقی تھی شاید وہ درد اور تکلیف کی شدت سے بے ہوش تھا اور اگر کچھ لمحے بھی مزید پانی میں رہتا تو اس نے مر جانا تھا...جل پری کے پاس سوچنے کو کچھ لمحے ہی تھے...ابھی چلبلی مچھلی بھی زیادہ دُور نہیں گئی ہوگی۔وہ اپنی پوری قوت لگا کے آدم زاد کو گھسیٹتی ہوئی بھوری چٹان سے باہر لا رہی تھی ۔اس کا اپنا سانس پھول رہا تھا۔وہ تو خود بمشکل تیر سکتی تھی اور اَب ایک بھاری بھر کم وجود کے ہمراہ وہ نڈھال ہو چکی تھی اور قریب تھا کہ وہ خود بھی اوسان خطا کر بیٹھتی کہ اس کی مخصوص سی آواز جو وہ رنگیلی مچھلیوں کو بلانے کے لیے نکالتی تھی ۔وہ نہ صرف چلبلی مچھلی بلکہ تمام رنگیلی مچھلیوں کو سنائی دی اور وہ سب آندھی وطوفان کی مانند اس تک پہنچ چکی تھیں ۔اسے ایک آدم زاد کو اپنے ساتھ گھسیٹتے دیکھ کر ششدر تھیں ۔اس کے پاس کچھ بتانے کو وقت نہیں تھا۔وہ اس کے کہنے پہ اسے اور آدم زاد کو اُٹھا کر روئی کے گالے کی طرح سطح سمندر پہ لے آئیں ۔جل پری آدم زاد کو گھسیٹتی ہوئی ساحل سمندر پہ لا رہی تھی ۔ رنگیلی مچھلیاں پانی میں سے باہر جھانک رہی تھیں...کسی کو کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی ۔وہ سب جل پری کی آنکھوں میں آدم زاد کا عکس دیکھ چکی تھیں اور یوں بھی گم شدہ محبت کی قبر دل میں اور عکس آنکھوں میں تاعمر دفن رہتا ہے ۔

جل پری آدم زاد سے بچھڑنے کے بعد پہلی مرتبہ ساحل سمندر کے پاس آئی تھی۔ وہ کبھی ساحل کی طرف جانے کا سوچتی بھی نہیں تھی۔ اسے ساحل کے قریب بھی جاتے ہوئے خوف آتا تھا۔ وہ اس دنیا کو دوبارہ مڑ کر کبھی دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی مگر قسمت نے آج اسے پھر اسی پتّھر کے کنارے لا کھڑا کیا جہاں وہ بے وفا اسے آخری بار چھوڑ گیا تھا اور آج وہ اسی پتّھر کے کنارے اسے چھوڑنے آئی تھی مگر یہ اس کی وفا تھی! جو اس کی زندگی بچانے پر مجبور کر رہی تھی۔ اسے پیٹ کے بل لٹا کر پہلے اس کے پھیپھڑوں سے پانی نکالنے کی کوشش کی وہ مدھم مدھم سی سانس لے رہا تھا۔ اگر ذرا سی دیر مزید ہو جاتی تو اس کا بچنا ناممکن تھا۔ ابھی بھی اس کا زندگی کی طرف لوٹنا ایک معجزہ ہی تھا کیوں کہ اس کی ایک ٹانگ کافی زخمی ہو چکی تھی اور زہر سارے بدن میں سرایت کر سکتا تھا مگر بھلا ہو سمندری گھوڑے کا جس کی منتری جڑی بوٹیوں نے ایک ہی پل میں سارا زہر نکال باہر کیا اور اس کے زخموں کے لیے تریاق کا کام کیا۔ وہی جل پری جس نے اس کی محبت میں اپنے جنموں سے دان کیے روپ کو بدلا تھا اور بدلے میں اسے آدم زاد کی بے وفائی اور خود غرضی ملی تھی اور آج اسی جل پری نے اس کو موت کے بھیانک پنجوں سے بچا لیا تھا مگر دنیا مکافاتِ عمل ہے تو قدرت نے اس کا انتقام خود لیا تھا وہ ایک ٹانگ سے معذور ہو چکا تھا اور اَب اگلی ساری عمر اسے اسی معذوری اور پچھتاوے کے ساتھ زندہ رہنا تھا۔

ضرار ہوش میں آ چکا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ وہ خالی خالی نظروں سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ پہلے اسے لگا کہ وہ مر چکا ہے مگر پھر کچھ دُور لوگوں کے گروہ دیکھ کے سمجھ گیا، کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ اسے عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا۔ کچھ دن پہلے ہونے والے بحری جہاز کا اچانک حادثہ اور پھر لاشعور سے جھانکتے ماضی کے واقعات... جل پری... اور اس سے جڑی گم گشتہ محبت کی یادیں جو اس کی اپنی ہی زیادتی کا شاخسانہ

تھیں۔اس نے بے تابی سے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔کچھ عجیب سا درد جاگ اُٹھا تھا دل میں۔پھر اس کی نظر اس بڑے پتّھر پہ جا کے ٹھہر گئی۔یہ تو وہی پتّھر تھا۔جہاں وہ اور جل پری ملا کرتے تھے۔بے چینی و بے قراری سے اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا وہ بے اختیار ہو کر پتّھر کی سمت لپکا کاش اے کاش کہ اس کی جل پری جس نے اس کی خاطر اپنا جنم دان کیا گیا روپ بھی بدل لیا تھا اور سب کچھ چھوڑ کر اس کے ساتھ اس کی دنیا میں چلی آئی تھی اور وہ ایک آدم زاد جو انتہائی خود غرض اور کٹھور نکلا کہ اسے بے یار و مددگار اسی پتّھر کنارے چھوڑ کر اپنی دنیا میں چلا آیا یہ سوچے سمجھے بغیر کہ وہ تو اس کی خاطر اپنا روپ بھی بدل چکی ہے اور یہ دیکھے بغیر کہ جل اسے دوبارہ قبولے گا بھی کہ نہیں۔اسے لگتا تھا کہ اس کا دم گھٹ جائے گا اس نے چلنا چاہا مگر لڑکھڑا کر گر پڑا اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ تو اپنی ایک ٹانگ بھی کھو چکا ہے کچھ لوگوں نے اسے دیکھ لیا تھا وہ اس کی طرف آرہے تھے۔وہ بے اختیار اس پتّھر کے گرد اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے کچھ ڈھونڈ رہا تھا مگر وہ تو جا چکی تھی۔جسے وہ ڈھونڈ رہا تھا۔وہ کہیں نہیں تھی۔وہ دیوانہ وار اسے آوازیں دے رہا تھا۔اسے اس وقت اپنی ٹانگ کے کٹ جانے کا بھی اتنا غم نہیں تھا جتنا کہ جل پری کے نہ ملنے کا،ارد گرد کھڑے لوگ اسے دیوانہ سمجھ رہے تھے۔اسے وہ لمحہ یاد کر کے کپکپی آگئی جب وہ بحری جہاز کسی خرابی کی وجہ سے سمندر میں ایک بہت بڑی بھوری چٹان کے قریب جا کے رک گیا تھا۔وہ بھی اسی جوش و جذبے کے تحت اس جہاز پہ سوار ہوا تھا کہ یہ جہاز چوں کہ سمندر میں بہت آگے تک جائے گا۔

”جل پری“ (حصّہ 23)

وہ اسی اُمید پہ اس بحری سفر پر روانہ ہوا کہ شاید کہیں جل پری کا سراغ مل جائے۔ جب بحری جہاز خرابی کے باعث بھوری چٹان کے پاس رک گیا تو اسے عجیب سا احساس ہوا کہ جیسے جل پری یہیں کہیں قریب ہی ہو۔ ان کے کچھ ساتھی بحری جہاز سے لاپتا ہو چکے تھے اور یہ ایک الگ معمہ تھا۔ سب اس صورتِ حال سے بے حد خوفزدہ تھے۔ پھر کسی نے ایک بہت بڑے آٹھ پنجوں والے آکٹوپس کو ان کے ایک ساتھی کو کھینچ کے لے جاتے ہوئے دیکھا۔ اب صورتِ حال واضح ہو چکی تھی... سخت چیخ و پکار شروع ہوگئی۔

ان کے ساتھی دوسرے بحری جہاز میں سوار ہو کر ان سب پھنسے ہوئے لوگوں کو بچانے آ رہے تھے اور جب ان کو حالات کی سنگینی کا پتا چلا تو وہ بھاری اسلحہ سے لیس ان کی طرف آ رہے تھے مگر ہونی کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ تمام لوگ آکٹوپس سے خوفزدہ ہو کر اندر چھپے بیٹھے تھے اور باہر آنے سے گریز کر رہے تھے مگر وہ جس مقصد کے لیے آیا تھا اسے ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ اچک اچک کے پانی کے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی عفریت نے اسے اپنے خوفناک پنجوں میں دبوچ لیا (اور اسے کیا معلوم تھا کہ اسی درندے کے ساتھ جل پری ایک مدت سے ایسے زندگی گزار رہی ہے کہ نہ زندوں میں ہے نہ مردوں میں) پھر اسے اپنی داہنی ٹانگ پہ شدید درد کا احساس ہوا جیسے کسی نے کند چھری سے

ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہوں۔

اسے اپنا وجود تاریکیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر وہ بس خواب ہی دیکھتا رہا کہ اس کا سانس بند ہو گیا ہے اور وہ پانی میں گر گیا ہے۔ پھر جل پری اسے اُٹھا لیتی ہے اور وہ نیلے پانیوں کی گہرائیوں میں جل پری کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ یہ اگر خواب تھا تو بے حد حسین بہت ہی انوکھا پھر اسے کچھ یاد نہ تھا آنکھ کھلی تو خود کو اسی پتّھر کے کنارے پڑا دیکھا۔ جہاں وہ اور جل پری پہلی بار ملے تھے۔ وہ جل پری کا وجود وہاں محسوس کر رہا تھا پھر جل پری کا وہاں موجود نہ ہونا... اس کی ایک ٹانگ کے نہ ہونے سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح چیخیں لگا رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک دھڑک کے اسے یقین دلا رہا تھا کہ جل پری یہاں آئی تھی۔ وہ اپنے چہرے پر اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر رہا تھا، پتّھر کے گرد زمین پر ایک ٹانگ سے خود کو گھسیٹتے ہوئے وہ اسے آوازیں دے رہا تھا۔ اس کا روم روم چلا رہا تھا کہ صرف ایک بار وہ اسے نظر آجائے اسے پتا چل جائے کہ وہ یہاں آئی تھی پھر یکبارگی اس کا ہاتھ کسی مانوس سی چیز سے ٹکرایا۔ وہ ٹھٹھک کر رُک گیا اس کے بٹن کے ساتھ کوئی چیز اٹکی تھی۔ وہ سبز و سنہری مور پنکھ تھا جو اس کے ماتھے میں کنداں تھا اس کی چیخیں رُک گئیں۔ دھڑکتے دل کو قرار آگیا۔ وہ اسے بار بار عقیدت سے چوم رہا تھا۔ اسے آنکھوں سے لگا رہا تھا۔ اب اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ لوگ اسے ایک گاڑی میں ڈال کے لے جا رہے تھے۔ وہ اس پنکھ کو نہایت مضبوطی سے تھامے بیٹھا تھا اور لوگوں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ کوئی دیوانہ ہے۔ ایسا دیوانہ جس سے اگر یہ پنکھ چھین لیا جائے تو شاید جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

جل پری سمندری گھوڑے کی منتری جڑی بوٹیاں آدم زاد کے زخموں پر لیپ لگانے کے بعد اس کی دھڑکن بحال ہوتے دیکھ کر آسودہ ہو گئی۔ اس کے زرد چہرے پہ نظر پڑتے ہی بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آ گئیں مگر دوسرے ہی پل اپنی قربانیاں اور اس کی زیادتیاں چشم زدن سے آنکھوں کے سامنے آن کھڑی ہوئیں وہ اس پر سے نظریں ہٹا کر

بے دردی سے آگے بڑھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ یکبارگی پلٹ گئی... آہستہ آہستہ اس کے قریب آ کر رُک گئی اپنے ماتھے کی طرف ہاتھ لے کر گئی۔ پھر کسی سوچ میں پڑ گئی۔

ماضی کے جھروکوں سے وہ شام جھانک رہی تھی جب چاندنی رات میں سمندر کنارے اسی پتھّر پہ بیٹھے پیار کی مالا جھپ رہے تھے... جب آدم زاد نے اس کے ماتھے پر لگے دو خوب صورت و دلکش سبز و سنہری مور پنکھ دیکھ کے کہا تھا کہ تم مورنی ہو یا جل پری... وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی... یہ جو دو پر ہیں نا یہ ہمیں پانی سے باہر آنے کے بعد سورج کی کرنوں کے ذریعے زمین پہ چلنے کی قوت دیتے ہیں... ان کے ٹوٹ جانے سے ہماری قوت بالکل ختم تو نہیں ہوتی مگر بہت کم ہو جاتی ہے اور... اگر ایک پر ٹوٹ جائے تو آدم زاد نے پوچھا تھا۔ پھر تھوڑی دیر ہی زمین پہ چلنے کے بعد ہمیں ہر صورت پانی میں اُترنا ہو گا اور ہم زمین پہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکیں گے۔ وہ معصومیت سے اسے اپنے آپ سے جڑے سب راز کسی دیرینہ دوست کی طرح دیتی رہی اور اگر یہ دونوں پر ٹوٹ جائیں تو کیا ہو گا جل پری خوفزدہ ہو گئی بس پھر مجھے ہمیشہ کے لیے پانی میں ہی رہنا ہو گا اور میں زمین پہ دوبارہ کبھی واپس نہیں آسکوں گی۔ اس لمحے تو آدم زاد بھی ڈر گیا تھا اور اسے ان پروں کا ازحد خیال رکھنے کو کہا تھا اور بعد میں جب آدم زادے کو پچھتاوں نے گھیر لیا اور اس نے جل پری سے اُکتا کر اسے جل میں ہی واپس چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ جل پری بھلا وہ دن کیسے بھول سکتی تھی جب آدم زاد اسے ساحل کنارے چھوڑنے کے بعد جانے سے پہلے، بے دردی اور بے رحمی سے اس کے ماتھے پہ لگے پیدائشی مور پنکھ نوچ رہا تھا۔ گھبراہٹ سے اس کے ہاتھ میں صرف ایک ہی پنکھ آیا... دوسرا اس کے ماتھے پہ ہی ثبت رہ گیا اور یوں وہ اکلوتا مور پنکھ بے وفائی کا نشان بن کے ہمیشہ کے لیے اس کے ماتھے پہ ثبت رہ گیا تھا۔

بے وفائی اپنی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ وہ صدمے سے گنگ رہ گئی۔ اس کی جدائی، اس کا اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ جانا اور اس کے مور پنکھ جو اس کی شان... اس کی قوت

تھے ان کا نوچ لینا اور وجہ جاننے کی اسے ضرورت نہ تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی بھی صورت اس کی تلاش میں دوبارہ اس کی دنیا میں آسکے۔ درد اور اذیت اس کے پورے وجود میں سرایت کرگئی۔ وہ اب کبھی کسی پہ اعتبار نہیں کرے گی۔ اس کے سارے وجود میں بے اعتباری کا زہر بھر گیا۔ محبت کے نام پہ کیا گیا دھوکا اسے زندہ درگور کر گیا تھا۔ انسانوں کی دنیا بے حد بدصورت تھی اور انسان خود بھی۔ اگر اسے قدرت نئے مور پنکھ بھی عطاء کردے تو وہ کبھی اس زہریلی دنیا میں واپس نہیں جائے گی۔ اس نے خود سے جو نہ توڑنے والا عہد کیا تھا وہ اس پہ تاعمر قائم رہے گی۔ تب ہی زہریلے آکٹوپس کا زہر اسے انسان کے زہر سے کم لگتا تھا۔

وہ اپنے خیالوں سے باہر آگئی تھی۔ اس نے جانے سے قبل اپنا دوسرا اور آخری مور پنکھ خود اپنے ہاتھوں سے توڑا اور آہستگی کے ساتھ آدم زاد کے بٹن کے ساتھ لگا دیا۔ کسی زمانے میں ایک پنکھ اس نے توڑا تھا کہ وہ اس کی تلاش میں زمین پہ نہ آسکے اور آج دوسرا پنکھ اس نے خود توڑ دیا تاکہ وہ کبھی زمین اور زمین پہ موجود زمین زادوں کی شکل بھی نہ دیکھ سکے۔ زمین پہ تھوڑی دیر مزید رُکنے سے اس کی سانسیں اُکھڑنے لگی تھیں کیوں کہ دونوں مور پنکھ ٹوٹ چکے تھے۔ اب وہ کبھی زمین پہ سانس نہیں لے پائے گی۔ نہ ہی زمین پہ آسکے گی۔ یہی تو آدم زاد چاہتا تھا۔ اذیت اب بھی ویسی تھی۔ بے چینی ابھی بھی عروج پہ تھی بس اب اس کی جگہ ٹھہراؤ نے لے لی تھی۔ وہ پھر رُکی نہیں۔ پتا نہیں اس میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ وہ تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی سمندر کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے ایک نظر بھی مڑ کر اس بے سدھ پڑے وجود کو نہ دیکھا جس کے دم سے کبھی اس کی سانسیں چلتی تھیں۔ وہ ایک بار پھر سمندر میں اتر گئی ہمیشہ کے لیے، کبھی واپس نہ آنے کے لیے اور اسی زہریلے آکٹوپس کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے... مگر ہمیشہ کچھ بھی نہیں رہتا یہاں تک کہ ظلم اور جبر کا تسلّط بھی... جب وہ حد سے گزر جاتا ہے اور صبر اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو رحمت خداوندی جوش میں

آجاتی ہے۔ پھر ظلم کو مٹ جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

لالچ، طاقت اور غرور کا نشہ کسی کو بھی وقتی فائدہ شہرت اور آسانی ضرور فراہم کر دیتا ہے مگر جبر سے خریدی گئی۔ خواہ وہ محبت ہو حکومت ہو یا دولت اسے دوام حاصل نہیں ہوتا۔ وہ جلد یا بدیر ضرور مٹّی میں مل جاتی ہے۔ آکٹوپس، جو اپنے لالچ اور عناد سے اس قدر طاقت ور بن گیا تھا کہ قدرت کی طرف سے اُگنے والے خود رو شجر لحم کی فراہمی کے باوجود اپنی طاقت کے نشے میں چور معصوم اور لاچار مخلوق کو نقصان پہنچانے سے گریز نہ کرتا اور سب سے بڑھ کے اس نے جل پری کو پیار محبت کا جھانسا دے کر اپنی قید اور غلامی میں عرصہ دراز سے اس کی مرضی کے خلاف قید رکھا ہوا تھا مگر کسی کی خاموشی بھی بعض اوقات بد دعا بن جاتی ہے اور ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے۔ وقتی ناکامی انسان کو مایوسی سے ضرور دو چار کر دیتی ہے لیکن یقین کامل ہونا چاہیے کہ غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے اور فتح ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے اور یہی انجام اس گھمنڈی آکٹوپس کا ہوا کہ جب وہ ایک ایک کر کے بندے بحری جہاز سے لے کر جا رہا تھا تو وہ جھٹ سے لوگوں کی نظروں میں آ گیا اور پھر ریسکیو کے لیے آنے والے دوسرے بحری جہاز سے باقاعدہ پلاننگ کے تحت اس پر اس وقت گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ جب وہ کسی بندے کو گھسیٹ کے لے جا رہا تھا اور وار ایسا نشانے پہ بیٹھا کہ اس کے پرخچے اُڑ گئے اور یوں اپنی طاقت اور قوت کے نشے میں چور وہ گھمنڈی آکٹوپس اپنے انجام کو پہنچا۔ اس کے فنا ہوتے ہی بھوری چٹان بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور یوں ظلم و جبر کا یہ باب تمام ہوا۔

''جل پری'' حصّہ 24 (آخری حصّہ)

بحری جہاز واپس لے جایا جا چکا تھا اور اس کے ساتھ ضرار کو بھی جو لوگ اُٹھا کے لے گئے تھے انھوں نے اس کے والد کو اطلاع کر دی۔ یوں اسے شہر کے سب سے بڑے ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ جہاں بہت عرصہ تک اس کی زخمی ٹانگ کا علاج ہوتا رہا مگر وہ گھٹنے تک کاٹنی پڑی ورنہ زہر سارے جسم میں سرایت کر جاتا اور اس کی زندگی بچانی مشکل ہو جاتی۔ ہسپتال سے اسے اُٹھا کے گھر لایا گیا۔ الوینہ تو پہلے ہی اس کی زندگی سے جا چکی تھی اب آنٹی دُردانہ کے لیے وہ فقط زحمت تھا کیوں کہ ان دونوں نے اپنے پلان کے مطابق اس سے جو فائدہ لینا تھا لے لیا تھا۔

اس واقعے کے بعد تو اس کی ذہنی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو چکی تھی۔ وہ اچانک ہی ہوش و حواس سے بے گانہ ہو جاتا اور کئی کئی دن ہوش میں نہ آتا۔ ہشام صاحب نے اپنی ساری مصروفیات ترک کر کے اس پہ توجہ دینی شروع کی لیکن لگتا تھا کہ اب اسے اس توجہ اور محبت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ بیساکھیوں کے سہارے چلنا شروع

کر دیا۔ کبھی کبھی وہ خود کلامی کرنے لگتا تھا اور کبھی ہفتوں بیت جاتے اسے کوئی بات کیے۔ ہشام صاحب نے اسے اس کے کچھ دوستوں کے کہنے پہ جھل مگسی کے اسی ریسٹ ہاؤس کی ریزیڈنسی میں شفٹ کر دیا، جہاں سے اس کی زندگی کو یہ روگ لگا تھا کیوں کہ وہ اپنے اثر رسوخ سے یہ کھوج لگا چکے تھے کہ جو بھی ہوا اسی جگہ سے اس کا گہرا تعلق ہے اور یوں بھی گمشدہ چیزیں عموماً وہیں سے ملتی ہیں۔ جہاں کھوئی ہوتی ہیں۔ اس کی حالت تھوڑی سنبھلی تو وہ اسے وہاں چھوڑ کے واپس لوٹ گئے۔ جل پری کے ماتھے کا پر وہاں موجود لوگوں نے ہار کی طرح اس کے گلے میں ڈال دیا اور وہ اسی حال میں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا۔ وہاں موجود عملہ اس کی دیکھ بھال کرتا رہتا اور ہشام صاحب کو اس کے بارے میں مکمل آگاہی بھی دیتا تھا لیکن رفتہ رفتہ ہر ایک نے اسے اس کے حال پہ ہی چھوڑ دیا۔ وہ بعض اوقات کئی کئی دن پاگلوں جیسے حلیے میں پھرتا تھا اور اسی پتّھر کنارے آ کے پہروں بیٹھا رہتا۔ جب تک کوئی اسے وہاں سے اُٹھا نہ لیتا۔ رفتہ رفتہ اس کی کہانی سارے جھل مگسی میں مشہور ہو گئی اور وہ پتّھر جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا۔ وہ ساحل ''جھل پری'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے تو یہ تک کہہ دیا کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے اس پتّھر کنارے جل پری کو پانی سے نکلتے اور پھر اندر جاتے دیکھا ہے۔

آکٹوپس اور بھوری چٹان کا قصّہ تمام ہوتے ہی جیسے پورے جل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تمام جل واسی اس کے ظلم و جبر اور قتل و غارت سے عاجز آنے کے علاوہ اس بات سے بھی اس سے متنفر تھے کہ اس نے ان کی چہیتی جل کی رانی کو زور زبردستی سے بھوری چٹان میں قید رکھا ہوا تھا۔ اب جل پری کی واپسی ان سب کے لیے... خاص طور پہ مہا مچھلی کے لیے بہت خوش آئند بات تھی... جل پری آکٹوپس کے مرتے ہی جل محل میں واپس آ گئی تھی اور وہ دن بہت خوش کن تھا جب رنگیلی مچھلیوں اور سمندری گھوڑے کے پاس رہ کر جل پری نے ایک بہت خوب صورت بچے کو جنم دیا تھا اور اس سے بھی بڑھ کے حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ

وہ ایک جل مانس تھا۔جب اسے جل پری کے سامنے لایا گیا تو وہ اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی کیوں کہ وہ تھا تو ایک جل مانس...لیکن اس کی شکل بالکل ضرار جیسی تھی۔قدرت نے کتنا خوب صورت تحفہ دیا تھا اسے کہ اگر وہ ایک انسان ہوتا تو بہر صورت جل بدری ہی اس کا مقدر بنتی لیکن اللہ نے اس کے سارے دُکھوں کا مداوا کر دیا تھا۔جل پری کی جل محل واپسی کے بعد بہت سے جل واسیوں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا...جن میں کچھ تو دوسرے جل سے آئے ہوئے جل مانس بھی تھے...لیکن مہا مچھلی کے پرزور اصرار کے باوجود اس نے سب کو انکار کر دیا۔

اس نے ایک آدم زاد کی محبت کو آزما کر سب کچھ کھو دیا تھا...حتیٰ کہ اپنا آپ...اپنی پہچان...اور کسی پہ کیا جانے والا اعتماد اور یقین بھی...جس نے اسے آکٹوپس جیسے خونخوار اور وحشی درندے کے چنگل میں لا پھنسایا۔زندگی میں ہونے والی اس ٹوٹ پھوٹ نے اسے توڑنے کے بجائے بہت مضبوط بنا دیا تھا اور اَب اس نے بنا کسی سہارے اور رشتے کے زندگی کا سفر طے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ اپنے اس فیصلے پہ بہت مطمئن تھی۔مہا مچھلی اس کے اعتماد پر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پر یقین بھی تھی کہ اب اسے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔جل پری کے دل میں...نہ کسی کی محبت باقی رہی نہ ہی کھو جانے والی محبت کا دُکھ...اب وہ ساری عمر کسی پہ اعتبار نہیں کرے گی اور رنگیلی مچھلیوں کے ساتھ جل کی رانی بن کے رہے گی اور یوں بھی اب اسے پانی پہ چلنا آ گیا تھا اور اپنے زور بازو پہ...پانی پہ چلنے والے کبھی گرتے نہیں ہیں...سہارے انسان کو کمزور بنا دیتے ہیں اور اکیلے چلنے والے محض اپنے بَل پہ آگے بڑھتے ہیں تو راستے میں لگنے والی ٹھوکر ان کے راستے میں رکاوٹ بننے کے بجائے ان کی رفتار کو مہمیز کرتی ہے۔مہا مچھلی نے اس کے فیصلے کو من و عن تسلیم کر لیا تھا۔وہ اسے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتی تھی اور اگر یہی اس کی مرضی تھی

تو سارا جل اس کے اس فیصلے میں اس کے ساتھ کھڑا تھا۔جل مانس جو جل پری کی اُمید لگا کے بیٹھے تھے۔ناکام ونامراد ہو کر واپس پلٹ گئے۔مہا مچھلی نے جل پری کے بچے کو قبول کرلیا تھا۔جب اسے یہ پتا چلا کہ وہ ایک جل مانس ہے۔اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیوں کہ جل کا راجہ آگیا تھا جو جل پری کے ساتھ مل کر سارے جل پہ حکومت کرے گا۔

سڑک کنارے ایک مفلوک الحال شخص،خود سے بیگانہ ایک ٹک کسی خلائی نکتے پر نگاہ مرکوز کیے بیٹھا تھا۔سردی، گرمی، بہار، خزاں، ہر احساس سے عاری...شدید گرمی میں پہنا گرم کوٹ...سر اور داڑھی کے بال بے ترتیبی سے بڑھے ہوئے... گلے میں جل پری کا پر ڈالے اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا۔صُبح سے شام تک اسی طرح بھوکا پیاسا پڑا رہتا...ارد گرد کے لوگ ترس کھا کے کچھ دے دیتے تو ٹھیک...ورنہ نہ بھوک اسے کچھ کہتی نہ پیاس...کسی نیک بندے نے ترس کھا کے اسی جل کنارے ایک جھگی بنا دی تھی کیوں کہ وہ ایک ٹانگ کٹی ہونے کے باعث چلنے پھرنے سے قاصر تھا۔جہاں اب لوگ اسے بہت پہنچا ہوا سمجھنے لگے تھے...سب کا خیال تھا کہ یہ کوئی اللہ والا ہے۔ جسے دنیا اور دنیا داری سے کوئی غرض نہیں...اور...اگر غرض تھی تو صرف اس مور پنکھ سے...جسے وہ ہمہ وقت اپنے سینے سے لگائے رکھتا۔اگر کبھی کبھار چھوٹے بچے اسے تنگ کرنے کی غرض سے وہ اس سے چھیننے کی کوشش کرتے تو وہ مرنے مارنے پہ آجاتا تھا۔کبھی کبھار اسے شدید قسم کا دورہ پڑتا تھا اور وہ چلا چلا کر کسی کو پکارتا تھا...پھر...کسی نادیدہ وجود کی طرف لپک لپک کے خود کو گھسیٹتا ہوا لے کر جاتا تھا۔پھر آخر میں کسی کو پاس نہ پا کر باآواز بلند دھاڑیں مار مار کے رونے لگ جاتا...اس قدر درد بھری آواز...کہ ارد گرد کھڑے لوگ بھی خاموشی سے ترحم بھری نظروں سے اسے دیکھتے رہتے... پتا نہیں اس نے زندگی میں ایسا کیا کھو دیا تھا کہ اسے ایک پَل بھی چین نہیں پڑتا تھا اور وہ پھر کئی کئی دن ہوش وحواس سے بے گانہ پڑا رہتا۔

اس دن بھی اس کی حالت تشویشناک تھی۔ وہ بار بار جل کی طرف جاتا اور پھر واپس پتّھر پہ آکے بیٹھ جاتا۔ اچانک وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ یکا یک اس کی نظر گلے میں پڑے مور پنکھ کی طرف چلی گئی جو اس بار بار کی تگ و دو کی وجہ سے دھاگے سے نکل آیا تھا۔ کہیں سے ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور وہ اُڑنے لگا۔ اس کا رُخ جل کی طرف تھا۔ وہ جو چلنے پھرنے سے ہی معذور تھا۔ اس کے پیچھے چلنے کی کوشش میں لڑکھڑا کے ساحل سمندر کے قریب ہی بُری طرح گرا تھا۔ مور پنکھ کا رُخ جل کی طرف تھا۔ مور پنکھ یکا یک سمندر میں جا گرا تھا۔ جل سے کسی کا ننھا سا وجود باہر جھانک رہا تھا اور لپک لپک کے کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہوا کے دوش پہ اُڑتا مور پنکھ جل کی سطح پہ گرتے ہی تیزی سے آگے ہی آگے سرکنے لگا۔ ننھا جل مانس کلکاریاں کرتے ہوئے...اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا...